تاریخ تختِ طاؤس

مولوی محمد عبداللطیف خان

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تاریخ

تختِ طاؤس

یعنی

دولتِ مغلیہ کے پانچویں تاجدار شاہجہاں کے شہرآفاق تخت 'تخت طاؤس' کے

تاریخی حالات

مولوی محمد عبداللطیف خان، کشتہ، قادری، منشی فاضل (آنرز ان پرشین)

بی۔ایل۔ای مؤلف 'حیات عزیز'

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/86روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1809

Takht-e-Taoos

By: Moulvi Mohammad Abdul Lateef Khan

ISBN :978-93-5160-022-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان کا سفر حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں ردوقبول سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔ اردو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو پکی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ تاریخ پر مبنی یہ کتاب 'تخت طاؤس' نہ صرف ایک تخت کی داستان ہے بلکہ یہ عہد شاہجہاں اور مغلیہ سلطنت کے حقائق سے بھی وابستہ ہے۔ اس کتاب میں اس عہد کی جمالیات ،معاشرت اور حکومتی انتظامات کی تصویر کشی اور ہنگاموں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نادر شاہی حملہ اور تخت طاؤس کا ایران منتقل ہونا اور اس سلسلے کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں 'تخت طاؤس' کو موضوع بنا کر مغلیہ سلطنت کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ عام قارئین کے لیے بھی یہ دلچسپ ہے۔ امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

(ڈائرکٹر)

انتساب

بجناب اقدس واعلیٰ۔

مربّیِ علوم وفنون، فخرِ ملک وملت، آنریبل، ڈاکٹر، سر، شاہ، محمد سلیمان

ایم۔اے، ایل۔ایل۔ڈی، بارایٹ لا، نائٹ

چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ، صدر ہندستانی اکادمی (یو۔پی)

(سابق) وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کیا عجب

کہ دنیائے تاریخ وتحقیق میں یہ ناچیز ذرّے اس آفتاب علم وادب کے پرتَو سے چمک اٹھیں اور اُن کی تاب وتابش کو بقائے دوام حاصل ہو۔

ارادت کیش

محمد عبد اللطیف خاں، کشتہ، قادری

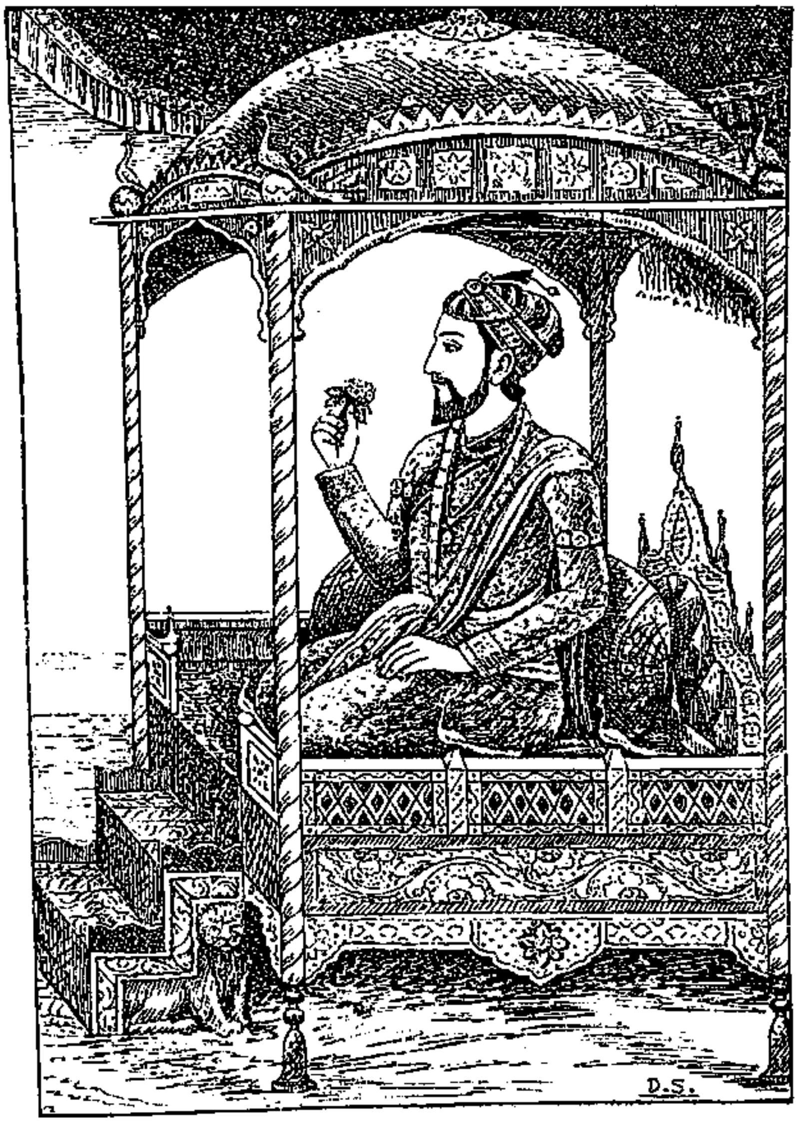

شاہجہاں بر تخت طاؤس

فہرست مضامین

سلسلہ نمبر	عنوانات	صفحات
1	تبصرہ و تعارف	17
2	مقدمہ	55
3	فہرست حوالہ جات	69
4	ہندوستان کی دلکشی	77
5	سلاطین مغلیہ	77
6	شاہجہاں	78
7	ولادت	94
8	تربیت	98
9	دادا سے محبت	100
10	تعلیم و شخصیت	102
11	جہانگیر کا خاندان اور اس کے تعلقات	103

سلسلہ نمبر	عنوانات	صفحات
12	جہانگیر کی وفات اور اس کے پسماندوں میں کشمکش	109
13	ہوا پرستان سلطنت مغلیہ کا قتل اور شاہجہاں کی تاجپوشی	112
14	شاہجہاں کا طور وطریق	115
15	شاہجہاں کے عہد میں دولت مغلیہ کا وقار اور بادشاہ کی سلیم الطبعی	123
16	دولت اور اس کا مصرف	125
17	سلاطین عالم کا مذاق	126
18	تخت طاؤس کی فرمائش	127
19	ایک تاریخی مغالطہ کا ازالہ	127
20	تخت طاؤس کی وضع اور اس کے لیے سونے اور جواہرات کا عطیہ	136
21	مہتمم تخت طاؤس	136
22	تخت طاؤس کی تصویر	139
23	ایک غلط تصویر	140
24	ایک معاون تصور تصویر	141
25	تخت طاؤس کی ہیئت	142
26	طول، عرض اور بلندی	142
27	پایوں کے متعلق ایک خاص بیان	143
28	حاشیہ	147
29	ایک تاریخی لعل	147
30	ایک خاص ستارہ	154
31	چھت	155

سلسلہ نمبر	عنوانات	صفحات
32	موروں کی تعداد اور اختلاف مؤرخین	156
33	محل وقوع طواویس	157
34	کیفیت طواویس	157
35	ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید	158
36	وجہ تسمیہ تخت طاؤس، نام اور وضع کا خیال ہندو قصص الاصنام سے لیا گیا	166
37	ہندوستان قدیم میں آلات پرواز	166
38	ایک نقل	166
39	سیڑھیاں	167
40	مصارف	167
41	تخت طاؤس صلد طلائی تھا یا اس پر سونے کا پتر منڈھا ہوا تھا؟	169
42	تخت طاؤس کی شکست پذیری	173
43	سال و مدت اتمام اور کاریگروں کی تعداد	174
44	مولانا قدسی کی ایک بے مثل مثنوی و تاریخ اور اس مثنوی کے متعلق شاہی قدردانی	174
45	تخت طاؤس پر جلوس اول	177
46	سنہ اور محل جلوس اولیں	184
47	ابو طالب کلیم ہمدانی وغیرہ کے قصیدے اور شاہی حوصلہ افزائی	185
48	شاہجہاں کی ایک غیر معمولی عنایت	186
49	تخت طاؤس کا دہلی پہنچنا	188

صفحات	عنوانات	سلسلہ نمبر
189	حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کے لیے شاہی نذرانہ "گل محمدی"	50
190	صاحب ظفر نامہ کے ایک قول کی تنقید	51
190	شاہان مغلیہ عملاً حامل خیال تجارت تھے	52
191	شاہجہاں کی معزولی ونظر بندی	53
191	جلوس عالمگیری	54
192	ایک روایت	55
195	اورنگ زیب کا قصد ترصیع مکرر تخت طاؤس	56
195	ارادۂ ترصیع مکرر پر شاہجہاں کی ناراضی اور عطائے جواہرات سے انکار	57
197	ترصیع مزید	58
198	تخمینۂ ٹیورنیر کی صحت کی دلیل مزید	59
198	کوہ نور تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں تعبیہ تھا یا نہیں؟	60
200	رحلت شاہجہاں	61
201	اورنگ زیب کا آگرہ آنا اور بہن کے ساتھ ہمدردی	62
202	تخت طاؤس کا ضرورتاً آگرہ پہنچنا	63
202	دولت مغلیہ کی حالت زار	64
203	خروج نادری	65
204	نہیب نادری	66
205	تخت طاؤس کا نادر کے قبضہ میں پہنچنا	67
206	نمائش ہرات اور اس میں تخت طاؤس کا رکھا جانا	68

صفحات	عنوانات	سلسلہ نمبر
207	نادر کا جشن فتح و فیروزی ہند منانا	69
207	قتل نادری	70
208	نادر کے بعد ایرانی خانہ جنگی	71
208	تخت طاؤس کا پارہ پارہ ہونا	72
209	پارہ ہائے تخت طاؤس کا بانی دولت قاچاریہ کے ہاتھ آنا اور ان ٹکڑوں کا نئی شکل میں متشکل ہونا	73
210	نومرتب تخت کی موجودہ حالت	74
211	چند اور ٹکڑوں کا انکشاف	75
211	تخت طاؤس کے رقیب شہرت	76
211	تخت طاؤس ساختہ بہادر شاہ اول یا اکبر شاہ ثانی	77
213	تخت طاؤسی ساختہ فتح علی شاہ قاچار	78
215	تخت طاؤس ساختہ نادر	79
216	امتیاز اسما	80

فہرست حواشی

(الف) مشاہیر رجال

سلسلہ نمبر	اسما	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ
1	آصف خاں	3	107
2	آقا محمد خاں قاچار	1	209
3	ابوطالب کلیم	6	114
4	اسفندیار	2	125
	اعتمادالدولہ	1	57
5	راجہ اودے سنگھ راٹھور	2	95
6	مرزا الغ بیگ	2	149
7	ڈاکٹر ایشوری پرشاد	2	162
8	بنارسی داس	2	111
9	برنیر	1	143
10	تیمورلنگ	4	96
11	ٹیورنیر	2	146
12	خان اعظم	3-1	100
13	خسرو	〃	100
14	داور بخش	1	110
15	رستم	1	124

سلسلہ نمبر	اسما	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ
16	علامہ سعد اللہ خاں	7	122
17	سعید احمد	1	139
18	سرکار	9	165
19	سر سید	6	164
20	شاہ عباس صفوی	3	149
21	شاہ پہلوی	6	169
22	علامہ شبلی	8	165
23	شہریار	1	103
24	شیر افگن خان	4	107
25	صاحب مآثر الامرا	7	134
26	صاحب ظفر نامہ	1	137
27	علامہ افضل خاں	5	151
28	فرعون	8	122
29	قدسی	4	176
30	لارڈ کرزن	1	141
31	محمد اعظم شاہ	4	131
32	شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی	6	132
33	ملا عبد الحمید لاہوری	3	131
34	مرزا شاہ رخ	1	148
35	مان سنگھ	3-1	101

سلسلہ نمبر	اسما	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ
36	مہابت خاں	4	111
37	منوچی	1	179
38	ولیم اروِن	1	170
39	ہندال مرزا	2	99
40	نادر قلی	1	203

(ب) خواتین مشاہیر

1	جہاں آرا بیگم	4	179
2	جہاں زیب بانو بیگم	5	196
3	خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم	1	99
4	مان متی جودھا بائی	1	94
5	ممتاز محل	2	84
6	نور جہاں	2	105

(ج) عمارات، باغات اور مقامات

1	آگرہ	1	113
2	ایوانِ چہل ستون	13	182
3	تاج محل	1	79
4	جامع مسجد (دہلی)	4	89
5	حیات بخش	6	91
6	شالامار	7	91
7	قلعہ معلیٰ (دہلی)	3	88

سلسلہ نمبر	اسما	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ
8	موتی مسجد (آگرہ)	5	90
9	نقارخانہ	15	184
	(د) اشیا		
1	اسپک یا اسکی	14-12	182
2	کوہ نور	4	162
3	مغل اعظم	2	200
	ہ۔ ادبی و تاریخی الفاظ		
1	اردو	8	93
2	صاحب قران	3	96
3	عالمگیر	8-6	192
4	فہرست مال مغروبۂ نادر	2	205
5	قیراط	3	200
6	سلاطین	2	185
7	جہانگیر نامہ	1	103
8	سرکاری عمارتی گز	1	142
9	مراتب و مناصب	1	186
	(و) رسوم		
1	آئین دربار		...... —
2	جشن شمسی	6-5	181
3	جشن نوروزی	3	179
4	جشن وزن قمری		181

ز۔تصاویر

تشریح	تصویر	نمبر شمار
شاہجہاں بر تخت طاؤس (صفحہ 6 پر)	تخت طاؤس	1
(ساختہ فتح علی شاہ قاچار۔فرمانروائے ایران) کا گلستان محل (طہران) میں ایک منظر (صفحات 212 پر)	تخت طاؤسی	2

تبصرہ وتعارف

'مصنوعات' خواہ وہ کسی قسم کے ہوں صناعوں کی ذہنیت کے آئینے ہیں۔ جن میں ان کی پاکیزگی ولطافت طبع شستگی ودماغ ومذاق عالی ہمتی غرض تمام جذبات، تخیلات اور تاثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ گویا جس طرح ایک ماہر علم قیافہ کسی تصویر کو دیکھ کر اس کے خدوخال سے صاحب تصویر کی خارجی، باطنی وذہنی کیفیات پر حکم لگا سکتا ہے۔ قطعی اسی طرح ایک ماہر فن آثار قدیمہ ہر قسم کی مصنوعات پر غور وفکر کر کے صانعین کے تمدن اور عہد صنعت کی تہذیب کو منکشف کر سکتا ہے، بناءعلیہ تذکرۂ مصنوعات، تدوین تاریخ تمدن کا حکم رکھتا ہے۔

ہندستان میں سلاطین تیموریہ کا عہد مسلم فرماں روایان ہند میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دراصل یہ حکومت ایک چوٹی کی حکومت تھی۔ جس نے ہر شعبۂ حیات اور مذاق وقت کے مطابق سامان زیبائش خصوصاً تعمیرات، پچی کاری، پرچیں سازی، مصوری، جواہر تراشی، زرگری ونقاشی پر مکمل دادسعی وتوجہ دی اور تاج (آگرہ) قلعہ آگرہ، اردوئے معلیٰ (دہلی) محلات فتح پور سیکری، سکندرہ واعتمادالدولہ (آگرہ) تخت طاؤس اور کوہ نور وغیرہ کے سلسلہ میں تو گویا مستقل صنعتی یونیورسٹیاں قائم کیں، جن میں سے نیت کی برکت کہیے یا نفاست طبعی وعالی دماغی کا صدقہ کہ عہد شاہجہاں کی نوادر ثلاثہ تاج محل، تخت طاؤس اور کوہ نور نے وہ شہرت حاصل کی

کہ ان کے تذکرہ سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے۔

ان میں سے مجسمۂ الفت 'تاج' کے متعلق مختلف زبانوں میں چند در چند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کوہ نور کے بھی جستہ جستہ حالات میسر آجاتے ہیں۔ لیکن شان وشکوہ کے اسٹیچو 'تخت طاؤس' کا کوئی مستقل تذکرہ علی الخصوص اردو زبان میں کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ اور ہے بھی یہ کہ زمانۂ قدیم کے طرز تاریخ نگاری پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سہل کام بھی نہیں۔ کیونکہ پراگندگی وانتشار مضمون تواریخ قدیم کا وصف نمایاں ہے۔ مگر اردو نے اپنی خوش قسمتی سے گذشتہ دس پندرہ سال کے اندر اس قدر ترقی کی ہے کہ آئے دن اس کا دامن وسیع ہوتا چلا جارہا ہے۔ اور کوئی علم وفن ایسا نہیں جس پر تھوڑی بہت کتابیں اس میں نہ لکھی گئی ہوں۔ منجملہ اور شعبۂ جات علوم وفنون کے تاریخ اور اس کے انواع پر خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اور گو تھوڑی سی ہی ہوں، لیکن فلسفیانہ طور وطریق پر لکھی ہوئی تاریخوں کی اس زبان میں کمی نہیں اور اس زبان کے دو بین، سلیم المذاق، ضرورت شناس اور ترقی کا درد رکھنے والے اہل قلم برابر اس کو ترقی دینے کی ان تھک کوششوں میں مصروف ہیں۔

میں اس وقت مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تحقیقی وتفتیشی مساعی کے نتیجہ تاریخ 'تخت طاؤس' کو جو اپنے مفید ترین حواشی پائیں صفحہ کی وجہ سے ایک مستقل 'قاموس التاریخ' کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں، پیش کرتا ہوں۔ تخت طاؤس عہد مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی، ترصیع وخوش مذاقی کا ایک مرقع تھا۔ اور اس کی صنعت صنعتِ ایران وہندستان کا ایک دلآویز سنگم تھی جس کی زیارت کے لیے دور دور کے ملکوں سے لوگ صعوبات سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگی نظر وتفریحِ قلب وتحیر کا پرشاد لے کر جاتے تھے۔ اور یہ تبرک مدت دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے جن کو منظر عام پر لا کر مولانا موصوف نے ملک وقوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور ان کی یہ کدو کاش قابل شکر گذاری ہے۔

تعارفِ مرتب

نام ونسب

محمد عبداللطیف خان نام، کشتہ تخلص، قادری لقب، منشی یعقوب علی خان مرحوم ومغفور کے بیٹے ہیں۔آپ کے مورث اعلیٰ رحمت خاں مرحوم جو یوسف زئی پٹھان تھے۔شاہ عالم فرماں روائے دہلی کے عہدِ حکومت میں ہرات سے ہندستان پہنچے اور اپنی نیزہ بازی کے کمال کے باعث 'برچھیت بہادر' کے خطاب سے مخاطب ہوکر فوج خاصہ میں کسی معزز عہدے پر سرفراز ہوگئے۔ ذات منصب کی جاگیر بھونگا دن ضلع مین پوری میں پائی۔لہٰذا وہیں طرح اقامت ڈال دی جسی آباواجداد صاحب باطن اور ارباب علم وفضل سے تھے جس کے باعث امراوٴعیان دولت مغلیہ وراجگان مین پوری کی استاوی واتالیقی کے منصب پر ممتاز رہے اوران کی قدردانیوں نے انھیں امارت کے رتبہ تک پہنچایا۔

ولادت

مولانا کشتہ 13/دسمبر 1899 کو اپنے وطن آبائی میں پیدا ہوئے۔اور چونکہ ان کے نانا مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اس لیے انھوں نے ان کی والدہ سے ان کو گود لے کر 6ماہ کی عمر سے اپنے پاس ریاست بھوپال میں رکھا اور وہ اس وقت سے تاحیات اپنے نانا مرحوم کے پاس بھوپال میں اور 1911 سے ان کے انتقال کے بعد اپنے والد ماجد کے پاس آگرہ میں جسے مرحوم نے اپنا وطن ثانی بنالیا تھا مقیم رہے۔

تعلیم وتربیت

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا صاحب سے پائی جو ایک اعلیٰ ریاضی دان، فارسی کے ادیب اور فن تاریخ کے ماہرین میں سے تھے۔اس کے بعد مدرسہ سلیمانیہ (بھوپال)، مدرسہ عالیہ (آگرہ) اور دارالعلوم (دیوبند) میں صرف ونحو عربی تمام کی اور حدیث، اصول حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، منطق وادب عربیہ کی متوسطات تک تحصیل کی۔آپ نے دیوان گوری[1] شنکر مولوی محمد رمضان صاحب (مفتی جامع آگرہ)، مولانا الحاج مولوی ضیاءاللہ سلام صاحب (امام جامع

آگرہ)، مولوی سعادت[2] محمد اللہ صاحب سنبھلی، حضرت شادان[3] بلگرامی، شاد ماں[4] لکھنوی جیسے مشہور ادیبوں سے تعلیم پائی۔ خوش نویسی کی مشق منشی لیلا[5] دھر صاحب، منشی علی[6] احمد صاحب، منشی شفیع اللہ صاحب جیسے حضرات سے کی۔ قرأت وتجوید کو قاری عبد[7] المالک سے سیکھا مگر ابتداءً جو کچھ پڑھا انتہائی بدشوقی کے ساتھ۔ البتہ 1916 میں اپنے دلی شوق سے اورینٹل کالج رامپور میں داخل ہوکر فارسی پڑھی اور مارچ 1917 میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کی ڈگری حاصل کرکے 1917 ہی میں وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ کے ہیڈ مولوی مقرر ہوگئے۔ 1918 سے 1922 تک شعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ کے ہیڈ مولوی رہے۔ 1922 سے محکمۂ تعلیمات یوپی کی ملازمت میں داخل ہوکر آگرہ، باندہ اور جھانسی میں معلم السنہ مشرقیہ کے عہدے پر سرفراز رہے۔ یہیں جناب ناصری مرحوم (صاحب صنادید عجم) کے مشورے کے مطابق 1829 میں آپ نے الہٰ آباد سے ایڈوانسڈ اِن اردو کا امتحان درجہ اعلیٰ میں پاس کیا انگریزی سے بھی حسب ضرورت واقفیت رکھتے ہیں۔ 1926 سے مین پوری گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعینات ہیں۔

1. آپ ریاست بھوپال کے اعلیٰ فارسی داں کانستھ حضرات میں سے تھے اور فارسی میں اس قدر یدطولیٰ رکھتے تھے کہ ابوالفضل بیدل اور ظہوری کے رنگ میں قلم برداشتہ نثر لکھ دینا آپ کے لیے ایک معمولی بات تھی۔

2. اب آپ پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر دینیات ہیں۔

3. سید اولاد حسین آپ کا اسم گرامی ہے۔ دور حاضرہ کے مشہور فارسی ادیب وصاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ اب اورینٹل کالج لاہور کے فارسی پروفیسر ہیں۔

4. سید محمد تقی نام عذب البیان اور قصائد خاقانی کے شارح، جدید فارسی کا بہترین مذاق رکھنے والے، حضرت شادان بلگرامی کے شاگرد رشید اور مدرسہ عالیہ رامپور کے اعلیٰ مدرس فارسی ہیں۔

5. یہ صاحب دربار بھوپال کے خوش نویس حضرات میں نمایاں اور ہندستان کے مشاہیر خطاط میں سے ہیں۔ 1923 تک حیات تھے۔

6 آپ آگرہ کے ممتاز خوش نویسوں میں سے تھے، عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

7 اب آپ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں مدرس ہیں۔ آپ نے عرب حجاز و مصر میں رہ کر فن تجوید کی تحصیل کی ہے۔

مذاق تصوف

مولانا کشتہ کے والد ماجد باوجود ملازم پولیس ہونے کے ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ اور چونکہ عموماً مفصلات میں تعینات رہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مولانا اہالیان پولیس کی صحبت سے الگ تھلگ رہیں اس لیے انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ مولانا مولوی ضیاالاسلام امام جامع آگرہ کے سپرد کر دیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے سولہ سترہ برس کی عمر تک کا تمام زمانہ امام صاحب موصوف کی صحبت میں بسر کیا۔ امام صاحب موصوف ایک شیخ وقت ہیں لہٰذا ان کی صحبت نے مولانا پر ایک خاص اثر ڈالا۔ ادھر انھوں نے شاہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور گو وہ صوفی یا عارف نہ ہو سکے تاہم تصوف کے رموز و نکات سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ غالباً 1915 میں انھوں نے رسالہ 'شعلہ' دہلی میں ایک مضمون بہ عنوان 'دل' لکھ کر شائع کیا تھا، جو اہل دل کی نظر میں سرمۂ بصیرت و دوائے درد دل ثابت ہوا۔

مذاق موسیقی

وہ فن موسیقی سے ایک خاص لگاؤ اور مناسبت تام رکھتے ہیں۔ گانا سننے کا انھیں بہت شوق ہے۔ علمی طور پر اس فن کے نکات پر حاوی ہیں چنانچہ ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: 'مارواڑی گیت' پرچ، کالنگڑہ سوہنی اور مانڈ کی راگنیوں کے لیے علی الخصوص بہت موزوں ہوتے ہیں۔ (رسالہ 'غالب' آگرہ۔ بابت ستمبر 1930)

شوق مطالعہ

چونکہ ان کے نانا مرحوم جن کی تربیت میں ان کا ابتدائی زمانہ گزرا مطالعہ کے ایک بہت بڑے شائق بزرگ تھے۔ اس لیے وہ بھی ہمیشہ سے عادی مطالعہ ہیں۔ ان کا وقت بہت کم ضائع

جاتا ہے اور بیماری کی حالت میں بھی مطالعہ سے باز نہیں رہتے۔ مطالعہ کے باعث ان کی نظر بہت وسیع ہے اور وہ مختلف علوم وفنون میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں۔ جھانسی گورنمنٹ کالج کے ایک معائنہ کے وقت ان کے لیکچر سے متاثر ہو کر ناصری مرحوم ہیڈ ماسٹر (علی گڑھ) کی نظر دور بین نے اس امر پر خوب تاڑا اور رپورٹ معائنہ میں لکھا تھا:

''مدرس ایک بہت ہی قابل آدمی ہے اور بہت ہی تازہ اور وسیع معلومات رکھتا ہے۔
اس کا لیکچر بتلاتا ہے کہ اس نے علوم ادبیہ کا بہت ہی اچھے طور پر مطالعہ کیا ہے۔''
(ماخوذ از رپورٹ معائنہ ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ بورڈ، گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی بابتہ سال 28-1927ء مرتبہ مسٹر آر ایس ویر ایم اے، آئی۔ای۔ایس اور سید مہدی حسین ناصری ایم۔اے، پی۔ای۔ایس)

فن تاریخ سے دلچسپی

چونکہ ان کے نانا صاحب فارسی کے اعلیٰ ادیب تھے اس لیے مسٹر ولیم اردن (صاحب لیٹر مغل) جن کی ماتحتی میں وہ محکمہ بندوبست میں تعینات تھے۔ ان سے بسا اوقات علمی و تاریخی امداد لیتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ فن تاریخ کے بڑے ماہر ہو گئے تھے اور ان کی تربیت نے مولانا کشتہ پر بھی تاریخ بینی کا جذبہ طاری کر دیا تھا۔ ادھر بچپن میں مولانا شرر کے تاریخی ناول ان کے بہت زیادہ زیر مطالعہ رہے جنھوں نے اس جذبہ کو اور ابھارا۔ اب وہ ہمیشہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریخیں پڑھا کرتے ہیں۔ ان کی تاریخی معلومات کسی فاضل تاریخ سے کم نہیں۔ ان میں ایک خاص کیفیت ہے کہ وہ جب کوئی نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں تو اس کے مافیہ و ماعلیہ کی تحقیق میں بہت وقت صرف کر دیتے ہیں۔ کتاب پیش نظر ان کے اس مذاق کا آئینہ ہے۔

آداب مجلس سے واقفیت

چونکہ ان کے والد مرحوم نے ہمیشہ انھیں علمی مجلسوں اور علم دوست حضرات کی صحبت میں رکھا۔ ادھر بھوپال میں بڑے بڑے ماہرین علوم مجلس کی صحبت میں رہے اور خاص طور پر مولوی عبدالحمید صاحب سابق ہیڈ مولوی وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی، ابن

مولوی عبدالغنی مرحوم (مصنف حوارلعرب) کے پاس محض آداب مجلس سیکھنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔لہٰذا علمی مذاق رکھنے والوں کی ہم نشینی ان کی سرشت میں داخل ہوگئی۔وہ اعلیٰ مزاج داں، مشرقی ومغربی مجالس کے آئین وآداب اور چیزوں کے باقاعدہ رکھنے اور سجانے وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ان کی گفتگو بہت پرلطف، دلچسپ، ظریفانہ اور معلومات میں اضافہ کرنے والی ہوتی ہے۔

شاعری

ان کی فطرت شاعرانہ ہے اور وہ سراپا شعر ہیں۔گدازقلبی نے ان کو مکمل شاعر بنانے میں کمی نہیں کی ہے۔دیوبند میں جب پڑھتے تھے، دیوان خانہ میں وحشی ومسیحا تلامذۂ امیر و داغ کے رقیبانہ مقابلوں نے ان کے دل میں بھی شوق شعرگوئی پیدا کیا، غزلیں کہیں اور دوایک پر جناب فریاد کاکوروی[1] سے اصلاح لی۔پھر جھانسی میں چندغزلوں پر جناب آفتاب[2] اکبرآبادی سے مشورہ لیا اور چندغزلیں جناب شام[3] اکبرآبادی کو دکھائیں مگر اس خودفراموش جذبہ کو انھوں نے اپنا شعار نہیں بنایا۔وہ مشاعروں سے بہت گھبراتے ہیں۔شعروشاعری کے متعلق ان کے عقائد پر ان کے نوشتہ 'تعارف وتبصرہ' بر'تاثر[4] الشعراء' سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔خلاصہ یہ کہ وہ مشاعروں کو غیرضروری اور باعث نفاق سمجھتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں زیادہ دلچسپی نہیں لی ورنہ اس طرف متوجہ ہیں (اور اچھا ہی ہوا کہ ان کی طبیعت نے اب جورُخ اختیار کیا ہے وہ خوب ہے) تاہم انھوں نے جو کچھ کہا وہ دو قسموں پر منقسم کیا جاسکتا ہے۔ایک وہ حصہ جو قطعی صنعت ہے اور جس کے متعلق خود ان کا بیان ہے۔کہ''اس کے کچھ خاص مقاصد واغراض تھے''، دوسرا واردات جو حقیقتاً شعریت پر مشتمل ہے۔ان کا کلام جہاں جہاں مجھے ہاتھ آیا اس کو میں نے تلاش کر کے 'جذباتِ لطیف' کے عنوان سے بطورضمیمہ شامل تعارف ہٰذا کردیا ہے تاکہ وہ ان جیسے بے نیاز شاعر کے پاس رہ کر ضیاع وتباہی سے محفوظ ہوجائے اور ان کی زندگی کا یہ پہلو تاریک نہ رہے۔

1. مولوی مصطفیٰ حسین صاحب نام، فریادؔ تخلص۔لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی پروفیسر ہیں۔

2. سید ولایت حسین نام، 'فانوس' جھانسی کے ایڈیٹر۔ایک بہت ہی پاکیزہ مذاق کے شاعر ہیں۔

3۔ بابو پربھودیال نام رئیس آگرہ، 'پروین' نامی رسالہ آگرہ سے آپ ہی کی زیر سرپرستی نکلا تھا۔ عہد حاضر کے مشاہیر شعرا میں سے ہیں۔

4۔ مشاعرہ میں پوری بابتہ 30-1929 کی غزلیات بمشورہ مولانا کشتہ مع حالات شعرا اس نام سے شائع کی گئیں تھیں۔ اس کتاب کو برادر معظم حضرت نصیر علوی منصف مین پوری (حال متعینہ باندہ) نے مرتب کیا تھا۔ مولانا کشتہ کی یہ جدت ادبی حلقہ میں بہت ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔

سخن فہمی:

وہ ایک اعلیٰ سخن فہم ہیں۔ ایک زود فہم ہستی واقع ہوئے ہیں۔ ایک پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کی گتھی کو بہت آسانی کے ساتھ سلجھا دیتے ہیں۔ شعر کے مافیہ ماعلیہ پر بہت جلد پہنچ جاتے ہیں اور اس مولویانہ طرز سے کہ ہر شے میں تصوف نظر آتا ہے، بہت گھبراتے ہیں۔

مہارت تنقید

1927 میں پرنسپل کالج نے جھانسی گورنمنٹ کالج کے انٹرمیڈیٹ کلاس میں اردو ہندی کے افتتاح کی سفارش کرتے ہوئے باوجود یہ کہ ان درجات کو اردو پڑھانے کے لیے ایم اے اِن اردو کی قید ہے۔ محض مولانا کی قابلیت کے اعتماد پر خاص طور پر ان کی سفارش کی اور محکمہ نے بورڈ کی منظوری سے اجازت بھی دے دی۔ اور انھوں نے اس محنت سے اردو پڑھانا شروع کی کہ ان کا کام لائق ستائش ٹھہرا۔ اسی زمانہ میں ان کا ایک خاص ادبی جذبہ سوتے سے چونکا اور وہ جذبۂ تنقید تھا۔ چونکہ اس درجہ میں تنقید ضروری شے تھی۔ مولانا نے اُدھر توجہ کی گویا ایک سوتا تھا جو کھل گیا اور تنقید کا دریا ان کے دل ودماغ میں لہرانے لگا۔ انھوں نے بعض خاص تنقیدی مضامین لکھے ہیں، جو بے حد مقبول ہوئے۔ ان میں ایک مضمون ہے 'اصلاحات داغ' جو میری فرمائش پر رسالہ 'مشاعرہ' فرخ آباد کے لیے لکھا تھا۔ اس مضمون میں منشی دیبی پرشاد 'مائل' مین پوری کے کلام پر جو نواب فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم نے اصلاحات دی ہیں ان کو مع کلام 'مائل' اور اپنی آرا کے شائع کیا ہے۔ درحقیقت ایک مشکل کام ہے مصلح کی اصلاحات کی وجوہ کی تہ تک پہنچنا۔ مگر مولانا نے اس

طرح انجام دیا گویا اصلاحات کے وقت حضرت داغ مرحوم کے پاس بیٹھے ہوئے وجوہات دریافت کرتے جاتے تھے۔ اس مضمون کی ہمیشہ علمی طبقوں میں مَیں نے بہت تعریف ہوتے ہوئے سنی۔ 'ہمدم' لکھنؤ نے رسالہ مذکور پر تبصرہ کرتے ہوئے اس مضمون کی بہت تعریف توصیف کی تھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(1) شعر مائل:۔ طبیبو! مان لو کہنا میں اچھا ہو نہیں سکتا
مریض (ہجر) ہوں میرا مداوا ہو نہیں سکتا
اصلاحات داغ:۔ طبیبو! مان لو کہنا میں اچھا ہو نہیں سکتا
مریض (عشق) ہوں میرا مداوا ہو نہیں سکتا

مولانا کشتہ کا ریمارک:۔ ہجر سے عالم عشق کی صرف ایک کیفیت نمایاں ہوتی تھی اور شعر میں خصوصیت پیدا ہوگئی تھی۔ اصلاح نے مکمل دنیائے عشق ومحبت کو بھر دیا اور شعر بلند و وسیع ہوگیا۔

(2) شعر مائل:۔ جنازے پر ہمارے (روتے چلاتے) وہ جب آیا
کہا اہل عزا نے 'یا الٰہی! کیا غضب آیا'
اصلاحات داغ:۔ جنازے پر ہمارے (روتا چلاتا) وہ جب آیا
کہا اہل عزا نے 'یا الٰہی! کیا غضب آیا'

مولانا کشتہ کا ریمارک: وحدت، جمعیت، تذکیر و تانیث میں از روئے قواعد ومحاورہ حال و ذوالحال میں باستثنائے چند صورتوں کے مطابقت لازم ہے۔ مائل صاحب کے شعر میں 'وہ روتے چلاتے آیا' قواعد ومحاورے کی ایک فحش غلطی تھی۔ اصلاح نے عیوب قواعد ومحاورہ سے شعر کو پاک و پاکیزہ کردیا۔

(3) شعر مائل:۔ نہیں معلوم ہم کو کیا مرض ہے جو کہ اے مائل
معالج کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہیں سکتا
اصلاحات داغ:۔ دوا کیسی؟ شفا کیسی؟ یہ دردِ عشق ہے مائل
معالج کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہیں سکتا

مولانا کشتہ کا ریمارک: 'کیا مرض ہے' سے شعر میں ابہام پیدا ہو گیا تھا۔ اور 'جو کہ اے مائل' ایک بھدا ٹکڑا تھا۔ حضرت فصیح الملک مرحوم نے مرض کی تشریح 'یہ درد عشق ہے' کر کے 'دوا کیسی' اور 'شفا کیسی' دو ٹکڑے اپنی جانب سے پیوند کرتے ہوئے شعر کو نہ صرف وسیع، پرزور اور واضح ہی کر دیا۔ بلکہ مصرعہ ثانی کو چار چاند لگا دیے۔

بہرحال وہ ایک زبردست ناقد ہیں۔ ان کی نظر ہر پہلو پر پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایمان و دیانت کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جس طرح دوسروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اسی طرح اپنے عیوب بھی بے تکلف بیان کر ڈالتے ہیں۔

ہمہ گیری

ان کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ اور مطالعہ کے زور نے ہمہ گیری میں ایک شور خاص پیدا کر دیا ہے جس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جب وہ مضمون لکھنے پر آتے ہیں تو کوئی پہلو چھوڑتے نہیں۔ ان کے بعض مضامین ان کی اس خصوصیت مخصوص کا آئینہ ہیں۔ مثلاً الماس[1] کے ذیل میں انھوں نے ہیرے کی کیمیاوی ماہیت پر ایک مخصوص تبصرہ کیا ہے۔ کوئی آدمی ان کا مضمون دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ محض برکت مطالعہ ہے۔ اور اس شخص کو علم کیمیا سے قطعی مس نہیں۔ یا اگر ارتقائے[2] نباتات ملاحظہ کیجیے تو آپ کو گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ مولانا علم النباتات کے ماہر کامل نہیں۔

1-2 یہ دونوں مضامین رسالہ 'ایجوکیشنل گزٹ' لکھنؤ کے جنوری فروری نمبر 1925 اور جنوری 1929 میں شائع ہوئے۔

قومی خدمات

انھوں نے بہت سی قومی خدمات انجام دیں جن میں انجمن 'معین الطبہ' آگرہ کی سکریٹری شپ بہت نمایاں ہے۔

اردو کی خدمت گزاری

انھوں نے علاوہ مضمون نگاری، تصنیف و تالیف کے بہت سے علمی مجالس و لائبریریاں اپنی

طالب علمی ہی کے زمانہ میں قائم کیں۔ بڑے ہو کر اور صاحب اثر بن کر بعض رسائل نکلوائے اور ان کی مدد کی۔ جھانسی کا رسالہ 'فانوس' ان ہی کی دماغ سوزی کا نتیجہ تھا۔ جس کی ایڈیٹرشپ بھی انھیں پیش کی گئی تھی لیکن محکمہ کی عدم منظوری کے باعث وہ اس کو انجام نہ دے سکے۔

ایک خاص خدمت زبان

انھوں نے اردو زبان کی ایک خدمت خاص انجام دی۔ یعنی برادران وطن میں سے بہت سوں کو اردو میں اظہار خیال کرنے، اخبارات و رسائل میں مضمون لکھنے کا چسکا لگا دیا۔ اور ان کا دل بڑھانے کے لیے اس سلسلہ میں اپنا بہت سا قیمتی وقت ان مضامین کی حک و اصلاح میں صرف کیا۔ جن حضرات پر انھوں نے اس معاملہ میں توجہ خاص مبذول کی ان میں آنجہانی منشی خوشی لال[1] مسرور' ورما فرخ آبادی، اور منشی[2] کالہ سہائے بی۔ اے، بہت نمایاں ہیں۔

1. منشی خوشی لال نام، مسرور تخلص، ورما کائستھ، قدیم باشندہ فرخ آباد۔ جھانسی کی عدالت کلکٹری میں ملازم تھے۔ کئی زبانیں، فارسی، ہندی، سنسکرت، بنگالی اور انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔ ہندو 'نعت گو' حضرات میں بہت ہی نمایاں تھے۔ پنشن لینے کے بعد اردو ادب کی خدمات میں وقت گزارا۔ اکثر رسائل و اخبارات آپ کے فیض قلم سے مستفیض ہوتے رہے۔ ہر قسم کی نثر پر قادر تھے۔ رسالہ 'فانوس' جھانسی کے معین ترتیب تھے۔ 1930 میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

2. آپ بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی ہیں اور فی الحال گونڈا گورنمنٹ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر سرفراز ہیں۔ افسانے اور تاریخی مضامین اچھے لکھتے ہیں۔

مضمون نگاری اور تصنیف تالیف

مولانا چونکہ اپنے نانا صاحب کو ہمیشہ لکھتے پڑھتے دیکھتے رہتے تھے اس لیے تصنیف تالیف کا شوق انھیں بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ اور جوں ہی انھوں نے ہوش سنبھالا اور معلومات بہم پہنچائی وہ عملاً اس طرف متوجہ ہو گئے۔ 1915 میں مدرسہ عالیہ آگرہ اور میاں 'میکش' اکبرآبادی کے مکان پر جو مولانا کے ہم سبق تھے ایک مجلس ادبیہ قائم ہوئی جس میں مضامین نظم و نثر لکھے اور سنائے جاتے

تھے۔ مولانا چونکہ اس مجلس کے ایک سرگرم ممبر تھے، لہٰذا انھوں نے بھی مضامین لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانہ کے مضامین میں سے 'دل' تھا، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ عرصہ تک اس طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ رامپور کے دوران قیام حضرت 'شادان' بلگرامی وشادمان لکھنوی کی صحبت میں جدید فارسی کا چسکا پڑ گیا۔ اور انھوں نے انگریزی ڈکشنریوں کے طرز پر ایک مبسوط لغت اپنے مربی امام صاحب جامع آگرہ کے نام نامی سے منسوب کر کے 'ضیاء اللغات' کے نام سے تیار کر ڈالا۔ پھر تاریخ تخت طاؤس لکھنی شروع کر دی۔ 1925 سے جبکہ وہ گورنمنٹ کالج جھانسی میں تعینات ہوئے، ایک مستقل علمی سوسائٹی ہاتھ آئی جس کے ارکان مولوی منظور علی ایم اے، بی۔ ای۔ ایس (فی الحال ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ)، مرزا علی احمد صاحب، فارسی پروفیسر (حال متعینہ جبلی کالج لکھنؤ)، مولوی ابوالبقا، بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی جیسے حضرات تھے۔ اس صحبت نے ان کو بالاستقلال قلمی دنیا میں داخل کر دیا۔ اور انھوں نے باقاعدہ تاریخی مضمون نگاری شروع کر دی۔ بابو گوپی لال ماتھر بی۔ اے۔ سی۔ ٹی پنشنر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول اور مدیر 'ایجوکیشنل گزٹ' لکھنؤ کی ہمت افزائیوں کو ان کی ادبی ترقیات میں خاص دخل ہے، جس کی بنا پر انھوں نے ملک کے مختلف رسائل واخبارات میں بیشمار ادبی، تاریخی وتنقیدی مضامین لکھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل اپنی خوبی میں بے مثل اور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

(1) الماس:۔ (رسالہ 'ایجوکیشنل گزٹ' لکھنؤ بابت جنوری فروری 1925) اس مضمون میں ہیرے کی ماہیت، مشہور ہیروں خصوصاً 'کوہ نور' کی تاریخی حالات ہیں۔

(2) ہما:۔ (رسالہ 'فانوس' جھانسی بابت فروری مارچ 1927) ہما کے تاریخی و ادبی حالات پر ایک محققانہ مضمون۔ یہ مضمون ان کے اس خیال کی ایک کڑی ہے کہ قاموس التلمیحات یعنی فیبلس انسائیکلوپیڈیا لکھی جائے۔

(3) تاریخ التحریر (ایجوکیشنل گزٹ لکھنؤ بابت جولائی 1925) فن تحریر کی تاریخ اور اس کے مدارج ارتقائی پر ایک بے مثل تبصرہ ہے۔

(4) ارتقاے نباتات:۔ (رسالہ ایجوکیشنل گزٹ۔ لکھنؤ بابت جنوری 1929) علم النباتات

کے سلسلہ میں نباتات کی پیدائش اور اس کے ارتقا پر بے حد مفید اور اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون۔

(5) ادب فارس و خدمات ہنود:۔ اس مفید و دلچسپ مضمون میں انھوں نے ہنود کی خدمات نظم و نثر فارسی اور ان کی اعلیٰ فارسی اور ادبی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو مئی تا اگست 1931 ایجوکیشنل گزٹ جالندھر میں شائع ہوا۔

(6) کاغذی سکہ:۔ زر کاغذی (نوٹ) کی تاریخی اور اس کے اقتصادی فوائد پر ایک دلچسپ و پُر از معلومات مضمون جو رسالہ چاند (اردو) الٰہ آباد کے فروری نمبر 1931 میں شائع ہوا۔

(7) برہما اور اس کی عورتیں:۔ (اخبار تعلیم لاہور 26 مئی و 2 جون 1930) ایک تاریخی جغرافیائی و معاشرتی مضمون۔

(8) میکدہ (دیوان حضرت میکش اکبرآبادی) پر 'تعارف' اور آثار الشعرا (مجموعہ غزلیات مشاعرہ مین پوری، مرتبہ حضرت نصیر علوی ایم۔اے) پر 'تبصرہ تعارف' گویا مستقل ادبی رسائل ہیں جو اہل علم میں بے حد مقبول ہوئے۔

حیات عزیز کی تالیف

وسط 1929 میں آپ نے ملک معظم ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم خلد اللہ ملکہ کے 'غسل صحت' کی یادگار میں نواب سر، قاضی، عزیز الدین احمد کے ٹی۔او بی ای۔سی آئی ای۔آئی ایس او۔ وزیر اعظم ریاست دتیا کے سوانح حیات 'حیات عزیز' کے نام سے لکھ کر شائع کیے۔

گو یہ کتاب 'تاریخ تخت طاؤس' کے بہت بعد میں تالیف کی گئی ہے۔ لیکن آپ کی تصنیفات و تالیفات میں اولیت اشاعت کا رتبہ اسی کتاب کو حاصل ہوا۔

یہ کتاب ترقی یافتہ جدید طرز سیرت نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ رسائل، اخبارات اور مشاہیر اہل قلم حضرات نے اس کے متعلق بہت ہی اچھی آرا کا اظہار کیا۔ میں صرف ملک کے مشہور ادیب و شاعر حضرت جگر مراد آبادی کی رائے کا اقتباس درج ذیل کرتا ہوں:

''حیاتِ عزیز کو اگر مولانا موصوف کی طبع لطیف کا شاہ کار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ زبان کی روانی وسلاست کا یہ عالم ہے گویا ایک دریا ہے مترنم ایک نغمہ ہے متبسم سیرت نگار کے سامنے سب سے زیادہ اہم اور نازک مرحلہ صاحب سیر کی زندگی کے تمام جزئیات پر نقد وتبصرہ ان میں ربط وتسلسل تاثرات ونتائج کی شرح وتفصیل کی صورت میں پیش آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار پر مولانا موصوف نے فن سیرت نگاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ جامعیت و اختصار، واقعیت ورنگینیٔ بیان اس تالیف کی خصوصیات ہیں اور یہ وہ خصوصیات ہیں جن کا توازن صحیح روح انشا کہا جاسکتا ہے۔ ملک وقوم میں جو نکبت وانحطاط راسخ ہوتا چلا جارہا ہے اس کی بنیاد میں صرف پست ہمتی اور عدم خود اعتمادی ہے۔ مولانا موصوف کی فکر نکتہ سنج نے اس حقیقت کو سمجھ کر ایک ایسی شخصیت کی زندگی کے کارناموں کو پیش کردیا ہے جو از ابتدا تا انتہا نمونہ ہے بلند ہمتی وخود اعتمادی کا مجھے کامل یقین ہے کہ اگر اسی طرح 'حیات نگاری' سے کام لیا جاتا رہا تو بہت جلد تعلیم یافتہ گروہ میں ایک تازہ روح بیداری پیدا ہوجائیگی''۔ (رسالہ 'مشاعرہ' فرخ آباد۔ بابت جون وجولائی 1931)

خصائل

وہ ایک ظریف الطبع مرنجان ومرنج، خوش باش، منکسر المزاج، بااخلاق، بے تعصب وضعدار اور سادگی وصفائی پسند آدمی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مغلوب الغضب اور صاف گو ہیں۔ مگر ان کی صاف گوئی تلخی آمیز ہوتی ہے۔ بیشتر ان کا طرز گفتگو یہ بتلاتا ہے کہ وہ سخت غضب آلود ہیں۔ حالانکہ انھیں مطلق غصہ نہیں ہوتا۔ بہت ہی شکی مزاج آدمی ہیں جس کی وجہ سے وہ جس کام کو انجام دیتے ہیں اس کا کوئی پہلو غیر محقق نہیں رہنے پاتا اور تحقیقات نہایت قابل اطمینان ہوتی ہے۔ بناوٹ اور تکلف سے پاک ہیں اور دوسروں سے بھی اسی کے خواہشمند رہتے ہیں۔ معاملات میں صاف اور سخت ہیں۔ روپے کی ان کی نظر میں قدر نہیں اور اس معاملہ میں ایک نہایت غیر منتظم آدمی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر دست نگر نہیں ہوتے تو فارغ البال بھی نہیں رہ پاتے۔

تبصرۂ کتاب

(1)

نفسِ مضمون

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخیں ایسی ہیں جن میں وسعت مطالعہ غور و خوض، تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال اور ازادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو۔ یا ان کے مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچے ہوں، پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ ان کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیش نظر کتاب 'تاریخ تخت طاؤس' ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔

وسعت مطالعہ

کسی تاریخی تصنیف و تالیف کے لیے ذوق مطالعہ ایک شے لازم ہے۔ ہمیں مولانا کشتہ کی زندگی سے تعارف کرا دینے کے بعد اس امر کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ اس سلسلہ میں ذرا سی بھی روشنی ڈالیں۔ کتاب اور اس کے حوالہ جات خود 'آفتاب آمد دلیل آفتاب' کے مصداق اور وسعت مطالعہ کے ضامن ہیں۔

غور و خوض

ہر انسان مختلف چیزیں دیکھتا ہے لیکن ان مختلف میں ایک متحد جھلک کا دیکھ لینا شعرائے باکمال، ارباب نظر اور مذاق تجسس اور غور و خوض رکھنے والوں کا ہی کام ہے۔ اس مذاق کا حامل ہونے کی یوں تو ہر علم فن میں ضرورت ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ فن تاریخ میں عادت مطالعہ کے ساتھ اس جوہر کی بہت ہی سخت احتیاج ہے۔ یہی چیز ہے جو ماضی و حال میں پیوند لگاتی، وضع جدید کی قطع و برید کو روشنی میں لاتی اور میدان تاریخ نگاری میں خضر راہ ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ ہذا میں آپ کو ایسے بے شمار واقعات نظر پڑیں گے۔

چنانچہ صفحات 61-65 کے حاشیہ نمبر 5 میں آپ نے مغلوں کے دربار اور دربار کے

طریق نشست و برخاست پر روشنی ڈالی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مغلوں کے دور میں کرسیاں ہوتی تھیں۔ اور قیاس کہتا ہے 'ان پر لوگ بیٹھتے ہوں گے' مگر مؤلف تاریخ ہذا نے لکھا ہے: 'خاص ہی خاص موقعوں پر مغلوں کے دربار میں چند معززین کو یہ موقعہ ملا ہے کہ وہ دربار شاہی میں مسند یا کرسی پر بیٹھ سکے ہوں۔ عموماً شاہزادے اپنے ذاتی دربار تک مسند ہی پر کیا کرتے تھے۔ مگر کرسیوں کے محل استعمال کا مسئلہ باقی تھا اس لیے فرماتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ ان چوکیوں، صندلیوں اور کرسیوں پر تو رخاصہ (اسلحۂ شاہی) نوادر و نفائس عالم، بیش قیمت نقرئی وطلائی ظروف اور اگردان وغیرہ چنے رہتے تھے۔'' یہ صحیح ہے کہ ہر آدمی کرسیوں پر سامان رکھنے کا مذاق اڑائے گا اور خصوصاً تہذیب حاضرہ کا متبع۔ لہٰذا اس کی عبرت کے لیے لکھتے ہیں: ''اسلاف کے مراسم کو ہمیں نگاہ ادب آمیز سے دیکھنا چاہیے۔ جس طرح ہر ملکے و ہر رسمے مشہور ہے اسی طرح ہر عہدے و ہر رسمے مسلم زمانہ و تہذیب زمانہ ہر روز تغیر میں ہے کیا عجیب ہے کہ مستقبل میں ہمارے طور طریق قابل مضحکہ قرار دیے جائیں۔ اور جگہوں کا تو مجھے حال معلوم نہیں۔ البتہ آگرہ میں میں نے عشرہ اولیٰ محرم الحرام میں دیکھا ہے کہ ورزشی اور کرتبی اکھاڑوں کے مرکزوں میں خنجر بچھوا، سیف اور کرتب و ورزش کے دوسرے سامان و آلات کرسیوں اور چوکیوں پر چنے جاتے ہیں۔ جو گویا سلاطین مغلیہ کے آئین دیرینہ کی یادگار ہے۔'' محولہ بالا سطور اور ایسے ہی گوناگوں واقعات بتلاتے ہیں کہ مولانا کشتہ میں غور و خوض اور تحقیق و تجسس کا ایک خاص مادہ ہے اور یہ تاریخ عام طرز تاریخ نگاری سے بالکل جداگانہ ہے۔

تحقیق و تفتیش

تحقیق و تفتیش تاریخ کا جزو لاینفک بلکہ اصل اصول ہے اور تاریخ نویسی کا انحصار در حقیقت اسی پر ہے۔ آپ کو مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ تاریخ 'تخت طاؤس' سراپا مجسمہ تحقیق و تفتیش ہے۔ اور مولانا کشتہ نے اس کے سلسلہ میں تحقیق و تفتیش کو اس کی حد انتہا پر پہنچا دیا ہے۔

تنقید

تنقید نہ صرف اس کتاب کی روح رواں ہے اور تحقیق و تفتیش پر ایک خاص روشنی ڈالتی ہے

بلکہ قدم قدم پر تنقید تاریخ کا عملی سبق دیتی ہے۔

انکشاف

اسی کمال 'تنقید' کی بدولت آپ دیکھیں گے کہ اس تاریخ کی بنیاد محض روایات پر نہیں بلکہ اس میں حوادث کا مشاہدہ درست کر کے تجربات سے ثابت شدہ قضایا کو تسلیم کیا گیا ہے اور معلوم سے غیر معلوم امور روشنی میں لائے گئے ہیں۔ مثلاً علی العموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تخت طاؤس ایک ہی تھا۔ شاہجہان نے بنوایا تھا۔ وہ ایران میں موجود ہے۔ لیکن صاحب کتاب نے ایک مستقل عنوان 'تخت طاؤس کے رقیب شہرت' قائم کر کے کئی ایسے سرٗ رکا تذکرہ کیا ہے جو اس نام سے موسوم ہوئے اور ان کو مختلف عہود میں مختلف سلاطین نے بنوایا ہے اور یہ کہ ایران میں اس نام کے دو تخت ہیں اور شاہجہانی تخت کے کچھ ٹکڑے ہی ہیں جو نئی شکل میں مرتب کیے گئے ہیں۔ کچھ ٹکڑے ترکوں کے پاس بھی تھے۔ جو انقلاب دولت عثمانیہ کے بعد بیچنے کے لیے فرانس بھیجے گئے تھے (ملاحظہ ہو 157 سے 164 تک)' یا' یہ امر مسلمہ ہے کہ مغل عہد کی تعمیرات و مصنوعات میں زیادہ تر ہندی اور ایرانی طرز تعمیر و صنعت کا میل ہے۔ مگر ہندستانی فن تعمیر و صنعت پر ایرانی تاثر کے مدارج اور ان کے ارتقا پر بھی یہ کتاب بے مثل تبصرہ کرتی ہے جس کی دلیل سطور ذیل میں ہیں:

> ''اگر ہم غور کریں تو اکبر کے عہد میں ایرانیوں کی آمد شروع ہوتی ہے اور جہانگیر و شاہجہاں کے زمانہ میں وہ اس کثرت سے ہندوستان پہنچ جاتے ہیں کہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں کا محلّہ محلّہ خطہ ایران بن جاتا ہے۔ اور فن تعمیر بھی اسی رفتار کے دوش بدوش متاثر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان اثرات کا ثبوت پکار پکار کر ہمیں وہ عمارات دے رہی ہیں جو اکبر اور شاہجہاں کے عہد کی یادگاریں ہیں۔ شاہجہانی عمارتوں 'تاج محل'۔ 'موتی مسجد' (آگرہ)، 'قلعہ معلّٰی'، 'جامع مسجد'، 'دیوان خاص و عام'، 'ثمن برج' (دہلی) میں جس نفاست مذاق اور سلامت طبع کا ذرہ ذرہ ہے وہ اکبری عہد میں تو بالکل عنقا ہے۔ جس کی مثال فتح پور سیکری اور قلعہ آگرہ کے وہ محلات ہیں جو اکبر کے دور حکومت میں تیار ہوئے۔ اور جہانگیری عہد میں اس کی آمد آمد کا

پتہ چلتا ہے جس کی تمثیل سکندرہ، ایوان جہانگیری اور مقبرہ اعتماد الدولہ آگرہ ہے۔ اس راز کو ایک تاریخ داں بآسانی یوں منکشف کرسکتا ہے کہ جہانگیری عہد سے خاندان اعتماد الدولہ کا رشتۂ اتحاد سلاطین مغلیہ کے ساتھ شروع ہوا اور اس کی نور افشانیوں نے عہد شاہجہانی میں یہاں تک امتیاز پایا اور ترقی کی کہ ایک ایک قریہ منور ہوگیا'' (مقدمہ 3-4)

یہاں 'نور افشانیوں' اور 'امتیاز' سے جو 'نور جہاں' اور 'ممتاز محل' اور ان کی وابستگی جہانگیر اور شاہجہاں کی طرف ایک پاکیزہ اور بے تکلف اشارہ ہوگیا اور جس نے ایک خاص نکتہ تاریخ کو حل کردیا وہ بالائے داد ہے۔

اجتہاد

اس کتاب میں جابجا آپ کو بے مثل اور قابل تسلیم تاریخی اجتہاد ملیں گے جو مؤلف کے تبحر علمی، وسیع مطالعہ اور اس کے ماہر فن تنقید وتحقیق ہونے کے شاہد صادق ہیں۔ مثلاً بعض مؤرخین و سیاحین کے مابین یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ تخت طاؤس ٹھوس طلائی تھا یا اس پر سونے کا پتر منڈھا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت سے مصنفین کے اقوال نقل کرکے اپنی رائے پیش کی ہے اور لکھتے ہیں:

''مسٹر لین پول نے سوانح اورنگ زیب کے حواشی میں ٹیورنیر کا یہ قول نقل کیا ہے: 'تخت پر سونے کا پتر جڑا تھا' اور لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنی کتاب پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن میں اسی سیاح کا یہ بیان لکھا ہے: 'اوپر بنا ہوا مور جو تمام پکھراج کا بنا ہوا ہے دم پھیلائے ہوئے ہے۔ اس کا جسم سونے کا ہے۔' برنیر اپنے وقائع سیاحت میں رقم طراز ہے:

'یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے جس کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں'۔

لیکن مورخین قدیم اور درباری تاریخ نگاروں کی تحریریں اس امر پر تبصرہ کرنے سے قطعی مجبور ہیں۔ مگر جب ہم اس تخت کے طول، عرض، بلندی اور سونے کی مقدار پر نظر ڈالتے ہیں تو چونکہ سونے کی تھوڑی ہی سی مقدار وزنی وسنگین ہوتی

ہے اور اس تخت میں صرف 31 1/2 من سونا استعمال ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو ہمیں اہل مغرب کی تحقیق صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور اوپر بیان کیے ہوئے مختلف اقوال کو مسلسل کرنے سے مندرجہ ذیل ترتیب ہمارے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

مور مجوف اور پائے ٹھوس تھے اور بقیہ سارے تخت پر دبیز پتر چڑھا ہوا تھا۔' (صفحہ 116-110)

مؤلف کا ریمارک جو مخطط ہے ہمارے بیان کردہ اوصاف کی دلیل ہے۔

اغلاط تاریخی کی تصحیح

میدان تاریخ گویا پل صراط ہے، ذرا قدم ڈگمگایا اور غلطی کے ایک تاریک گڑھے میں جا پڑے۔ تاریخ تخت طاؤس میں جس تحقیق اور تفتیش سے کام لیا گیا ہے اس میں اس قسم کا احتمال قریب قریب ناممکن ہے۔ بلکہ بجائے اس کے خود اس میں صدہا غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے اور اس کتاب نے ایک 'تاریخی صحت نامہ' کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ صفحہ 122 حاشیہ نمبر 4 پر قدسی کے حالات میں لکھا ہے:

''اورینٹل بایوگرافیکل (Oriental Biographical) ڈکشنری میں لکھا ہے کہ شاہجہاں نے اس کو خطاب 'ملک الشعرا' بھی دیا ہے تھا۔ اور اس کے بعد یہ خطاب ابوطالب کلیم ہمدانی کو عطا ہوا۔ لیکن بادشاہنامہ، خزانۂ عامرہ اور مآثر الامراء وغیرہ سے ایسا ثابت نہیں ہوتا کہ قدسی کو بھی یہ خطاب ملا ہو اور ان کتابوں کے مقابلہ میں لغات مذکور کا اعتبار ظاہر''

یا

صفحہ 48 حاشیہ نمبر 1 حالات شہریار کے ذیل میں تحریر ہے'۔ جہانگیر ابن اکبر اعظم کا بیٹا تھا۔ نور جہاں نے جہانگیر کے عقد میں آ کر اپنی بیٹی (لاڈلی بیگم) جو شیر افگن خان کے صلب سے تھی اس سے منسوب کر دی تھی۔ صاحب سیر المتاخرین اس کو

برادرزادہ جہانگیر اور پسر دانیال (المتوفی 1013ھ) بن اکبر اعظم لکھتے ہیں۔

چنانچہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ 248 میں لکھا ہے:

''بعد از آں کہ صبیۂ نور جہاں بیگم کہ از صلب شیر افگن بود در حبالۂ از دواج سلطان شہر یار برادرزادۂ جہانگیر پسر شاہ دانیال در آمد''۔

حالانکہ یہ صحیح نہیں......شہر یار جہانگیر کا بیٹا تھا۔ اولاد کی تحقیق ماں باپ سے بڑھ کر اور کسے ہوسکتی ہے۔ خود جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے:

''بعد از آں کہ بعضے فرزندان تولد یافتہ در آوائل صبیٰ برحمت حق پیوستند۔ در عرصۂ یک ماہ دو پسران از خواصاں تولد یافتند یکے راجہاندار و دیگر ے را شہر یار نام نہادم''۔

طریق استدلال

کوئی تنقیدی و تحقیقی کتاب دراصل طریق استدلال ہی سے وقیع ہوسکتی ہے۔ اس کتاب میں جہاں تحقیق اور تنقید کی کثرت ہے وہاں منطقی طرز استدلال کی بہتات اور وہ بھی قطعی علمی طریق پر، یہی وجہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں دل و دماغ خود بخود متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گو ضمناً امثلہ بالا میں علمی طریق استدلال کی جھلک جا بجا پائی جاتی ہے مگر برسبیل تذکرہ دو ایک مثالیں اور سہی۔

مقدمہ میں جہاں ذکر کیا ہے کہ مغلوں کی عہد کی عمارت خالص ہندی وایشیائی طرز تعمیر وغیرہ کا نمونہ ہیں اور ان میں مغربی میل جول نہیں وہاں ایک شک اپنی طرف سے پیدا کر کے کہ یورپ والے بھی تو مغلوں کے دربار میں موجود تھے کیوں نہ ان کے اثرات سے فن تعمیر متاثر ہوا ہوگا۔ ایک علمی، اصولی، طبعی اور سائنٹیفک جواب دیا ہے جو مؤلف کی عام معلوماتی وسعت کا آئینہ ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''جب ہم طبقات ارض پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صخور کی دو قسمیں نظر آتی ہیں۔ صخور آبی۔ صخور آتشی۔ آبی صخور اکثر اوقات بالائی سطوح کے داب کی وجہ سے مصفیٰ و مجلی

ہوکر آتشی ضحور کی شکل میں منقلب ہو جاتی ہیں۔اور اس طرح ایک تیسری قسم اور ظہور پذیر ہوتی ہے جو جواہرات کے معزز نام سے مخاطب کی جاتی ہے''۔

یورپ کی سطح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریب قریب تمام تر ازمنہ رباعیہ کی یادگار ہے اور سوائے اس کے کہ ہسپانیہ کی زمین تو آبی و آتشی ضحور سے مل کر بنی ہے ورنہ تمام یورپ کی بالائی سطوح پر آبی ضحور پائے جاتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئلہ بکثرت ملتا ہے اور جواہرات قریب قریب سب ہی ضحور آتشی کے لخت جگر ہیں۔اس لیے یہ امر بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ جب اہل مغرب کے یہاں کان جواہر ہی نہیں تو انھیں اس زمانہ ماضی بعید میں کان کنی، جواہر تراشی اور جواہرات کی تعبیہ و پیوند کی سلیم المذاقی میں دستگاہ کس طرح حاصل ہوتی (مقدمہ 6-7)۔

درحقیقت بقول مولانا کشتہ کے یہ ''اتنا عظیم الشان مسئلہ ہے جس کے ہوتے ہوئے مصنفین یورپ اور ان کے عقیدت مندوں کی وہ تمام توجیہات باد رہوا نظر آتی ہیں جو انھوں نے خالص ایشیائی مصنوعات ہند کی ساخت میں اہل یورپ کی شرکت ثابت کرنے کے لیے وضع کر رکھی ہیں۔''

آزاد خیالی و وسعت نظری

اس کتاب میں یوروپین مؤرخین کی پیروی نہیں کی گئی ہے جو اپنی ناواقفیت، تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر واقعات کو خواہ مخواہ رنگ دیتے ہیں بلکہ جس زمانہ کا حال لکھا ہے اسی زمانہ کے مورخین کی تاریخوں سے واقعات اخذ کیے گئے ہیں اور اس طرح ان تمام غلط خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بوجہ لاعلمی یا کسی مقصد ذاتی کی بنا پر جھوٹے حالات، سچے واقعات کی صورت میں مشتبہ کیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں مغربی مؤرخین کی غلطیوں کو غایت درجہ جسارت و دلیری سے مدلل طور پر فاش کیا گیا ہے اور پوست کندہ حالات لکھے گئے ہیں اور ان کی غلط فہمی، تعصب، تنگ خیالی اور ناواقفیت کو علی الاعلان ظاہر کیا گیا ہے۔چنانچہ ملاحظہ ہو صفحہ 102 تا 106۔عنوان 'ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید'۔

تاریخ تخت طاؤس کے مؤلف کی دقیقہ رسی، معاملہ فہمی اور بے تعصبی اس سے بھی ظاہر ہوسکتی ہے کہ انھوں نے تخت طاؤس کے موروں کے سلسلہ میں خواہ مخواہ کی ٹھونس ٹھانس اور اپنے موافق معاملہ سازی سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ لکھا ہے:

''ان طواویس ہی کی وجہ سے یہ تخت تختِ طاؤس کے نام سے موسوم ہوا تھا۔ میرے خیال میں اس تخت اور اس کے نام کا خیال اہل ہنود کی قدیم روایات سے اخذ کیا گیا ہے جو بتلاتی ہیں کہ اس نام کا ایک تخت ہندوستان کے عہد ماضی بعید میں بھی تھا۔ چنانچہ جین مت کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک راجہ مع اپنی رانی کے اس سبب سے کہ اس کے دیوان نے اس سے غدر و بیوفائی کی تھی وہ کیکئی ینتر (केकईयन्त्र) نامی تخت پر بیٹھ کر بھاگا۔ فضا میں پہنچ کر کسی خرابی کے باعث وہ تخت بگڑ گیا اور وہ دونوں ایک مرگھٹ پر گر کر مر گئے۔''

لفظ کیکئی ینتر (केकईयन्त्र) سریر طاؤس نما یا تخت طاؤس کے ہم معنی ہے۔ ہمارے خیال میں تخت طاؤس کیکئی ینتر نامی قصص الاصنامی خیالی یا واقعی تخت کے تخیل کی ویسی ہی حقیقی تصویر تھا جیسی بقول واحد یار خان بی۔اے تاج مقبرۂ ہمایوں کے ابتدائی خیال کی حد وانتہا ہے۔ (صفحہ 105)

یا

(2) مصارف تخت طاؤس کے سلسلہ میں مسٹر ای مارسڈن بی۔اے۔آئی۔ای ایس کا جو ہندستانی تاریخی درسی سلسلہ کے ایک مشہور مصنف ہیں، ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چونکہ صاحب موصوف کی درسی کتابوں میں اکثر امور کی بنا ضعیف روایات پر ہے اس لیے میں ان کی تحریر پر توجہ نہیں کرنا چاہتا'' (113)

(2)

ادبیت:۔ امور بالا تو تھے مضمون تاریخ 'تخت طاؤس' کے متعلق لیکن ابھی اس کے ادبی پہلو پر بحث کرنی باقی ہے۔

تاریخ میں تلاش ادبیت کی ضرورت اور معیار ادبیہ

جس طرح بقول مولانا کشتہ 'ایک لعل شب تاب ایک والیِ ملک کے جواہر طرف کلہ کے ساتھ اوجِ قسمت لعل و گہر کا معیار قرار پاسکتا ہے مگر گدڑی کا لعل ہو کر بے قدر رہ جاتا ہے' اسی طرح اعلیٰ تخیلات، پاکیزہ جذبات اور نادر و نایاب معلومات کے انمول موتی جب موزوں، برجستہ و برمحل الفاظ اور موثر و دلا دیز پیرائے میں ادا کر دیے جاتے ہیں تو ان کی خوبیوں میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن جب وہی جواہر پارے بھدے الفاظ اور معمولی طرزِ ادا کی تھیلیوں میں بھر دیے جاتے ہیں تو حرف ریزوں سے زیادہ کم وقعت اور ہیچ و پوچ ہو جاتے ہیں اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتا۔ اس لیے ایک مورخ کا فرض اولیں ہے کہ وہ اظہار خیال کے لیے دلچسپ اسلوب بیان اور مناسب محل و موقع الفاظ استعمال کرے۔

عام مورخین اردو کا طرز تحریر

ہماری زبان کے عام مورخین نے جن کا پایۂ ادبیہ بھی مسلمہ جمہور ہے یا تو تشبیہات و استعارات کے زور اور الفاظ کے شور سے پڑھنے والوں کے دماغ کو مسحور کیا اور تاریخ کو ہم پلہ داستان بنایا ہے یا اس قدر خشکی اور یبوست سے کام لیا اور دلائل و براہین کے گورکھ دھندے میں مضامین کو الجھایا ہے کہ مطالعہ کرنے والے کو تاریخ ایک بار گراں معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس تاریخ تخت طاؤس کی زبان بے حد سلیس و سادہ شستہ و پاکیزہ ہے۔ اس میں وہ لوچ اور برجستگی ہے کہ ناظرین خود بخود متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

الفاظ جدید کا استعمال و اختراع

ممکن ہے کہ بعض حضرات 'عکس گیر' (فوٹو کا کیمرہ)، تلاشکار (ریسرچ 'محقق') 'مجلّہ' (رسالہ)، 'ماحول' (اینٹ موسفیر)، 'قصص الاصنام' یا 'دیومالا' (مائی تھالوجی) اور آبی روکا احتکاک' جیسے مرکبات جدید دیکھ کر یا 'صلد' بمعنی (سالڈ ٹھوس)، حطب متحجر (کوئلہ) اور 'عالم برق' وغیرہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو اختراعات لفظی و ترکیبی پا کر تاریخ زیر بحث کو جدت نگاری و جدت طرازی کی ایک تمثیل قرار دیں یا 'بھارت ورش' کو بے تکلف استعمال ہوتے ہوئے دیکھ کر منہ بناویں۔ لیکن

درحقیقت یہی وہ خدوخال ہیں جو اس کتاب کو تازہ تصانیف میں بہت ہی ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ گویا اس کی زبان زبانِ جدید و قدیم کا ایک دلچسپ و خوشگوار مرکب ہے اور ہمارے سامنے زبان کے وسیع کرنے کے ذوق و ذرائع پیش کر رہی اور طریق کار کا عملی سبق دے رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو اس ادیب کی قلم کا نتیجہ ہے جس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت جگر مرادآبادی جیسے غیور ادیب نے تحریر فرمایا:

''زبان کی روانی وسلاست کا یہ عالم ہے گویا ایک دریا ہے مترنم ایک نغمہ ہے متبسم۔'' (مشاعرہ فرخ آباد بابت جون جولائی 1931)

مؤلف کا عقیدہ درباره محاوره لکھنؤ و دہلی

'تاریخ تخت طاؤس' کے مطالعہ کرنے والے کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب اس شخص کی لکھی ہوئی ہے جو محاورہ لکھنؤ اور محاورہ دہلی دونوں کو اچھا سمجھتا ہے اور یہ لازم جانتا ہے کہ ایک ہی مضمون میں اگر موقع آجائے تو دونوں کے اتباع کا ثبوت دے دے۔ چنانچہ

(1) عالمگیر نے بھی......ترمیم تنسیخ کرنی شروع کی (142) موافق محاورہ لکھنؤ

(2) یادداشتیں رامپور ہی میں قلمبند کرنا شروع کر دی تھیں۔ مقدمہ صفحہ 10 مطابق محاورہ دہلی

لیکن علی العموم اس کی زبان پر دہلویت غالب ہے جس کا باعث غالباً رہائش و تربیت آگرہ ہے۔ چنانچہ اہل لکھنؤ کے خلاف آپ اس کتاب میں ایسی اور ایسا کے موقع پر ہمیشہ جیسی اور جیسا ہی پائیں گے۔ مثلاً

'صاحب ماثر الامرا جیسی شخصیتوں کی کشیدہ شعبہ قلمی سے ماخوذ ہے' (86)۔

تشبیہات واستعارات:

اس کتاب میں تشبیہات اور استعارات ہیں لیکن صرف اسی قدر جس قدر کھانے میں نمک یا جیسے انگوٹھی پر نگ پھر اس لطافت کے ساتھ کہ کیف آمد سے مملو، تصنع اور آورد کا نام نہیں۔

اسلوب بیان

اس کتاب کا اسلوب بیان بہت ہی صاف سلجھا ہوا دلچسپ اور مؤثر ہے۔ جس میں خیالات

کا تسلسل اور زبان کی پختگی، الفاظ کا تناسب و توازن آپ کو اپنے دماغ پر جادو کرتا ہوا نظر آئے گا۔ مثلاً 'دولت اور اس کا مصرف' کے عنوان میں کہ تختِ طاؤس کی ساخت کے جواز کی تمہید ہے۔ لکھا ہے:

جواہرات کی مکلف تھیلیاں توشہ خانہ کے کسی گوشہ میں صندوقچیوں میں پوشیدہ رہیں۔ اور موقع بموقع نظارگیان عالم کو محو دید کر کے سلطانی ہیبت و جبروت کا ایک ناپائیدار اثر پیدا کریں تو ان کا یہ مصرف ہرگز اس قدر صحیح نہیں ہوسکتا ہے جس قدر کہ یہ طریقۂ استعمال کہ اس کو حسن و خوبی سے مرتب کر کے ہیبت و دبدبہ سلطانی، شان و شکوہ دارائی، عظمت و جلالت جہانداری کی جیتی جاگتی تصویر قرار دے کر ان سے روزانہ ایک مستقل و پائیدار اثر ہیبت و دبدبہ کا پیدا کیا جائے[1]

1 صفحہ 70۔

جدّت ادا اور مشرقیت

جدّت ادا کی بہت سی رنگین، پر لطف مشرقی اور بیشمار تمثیلات آپ کو اس کتاب میں ہاتھ آئیں گی۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

(1) یہ قوم (مراد یمنی) اپنے وطن مالوف سے اُٹھ کر ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران والوں سے اپنی ترقی میں ہم آغوش ہوئی۔ (مقدمہ ص5)۔

(2) ایرانی و ہندستانی صناعوں کے میل جول نے جس طرح فن تعمیرات و خطاطی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اسی طرح فن جواہر تراشی و نگینہ سازی میں ان کی ہنر شناسیوں اور ترکیبوں کے رنگا رنگ جوہر نمایاں ہوئے۔

(3) اکبر کے دور اور سلطنت مغلیہ کے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'انسانی رشتوں کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ پیوندوں اور ور ختوں سے ہندوستان چمنستان بن گیا۔ سنگھاسن بتیسی کی پریوں اور مہابھارت کے سورماؤں کی طرح صدہا ہزارہا ہندستانی تخیلات کے شاہکاروں نے ایرانی لباس پہن لیا۔' (مقدمہ ص3)۔

طرز ادا میں مغربیت کی جھلک

طرز ادا میں جا بجا مغربیت بھی آپ کو جھلکتی ہوئی دکھائی دے گی جو مؤلف کی روشن خیالی وسیع المعلو ماتی اور حمایت ترقی زبان کی دلیل ساطع ہے۔ مثلاً محمد شاہ رنگیلے کا سرسری تذکرہ اور سلطنت مغلیہ کی حالت زار بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

'بادشاہ تھا مگر شاہ شطرنج کہ کٹ پتلی کی طرح ذی اختیار منصب داروں کے ہاتھ میں کھیلتا تھا۔

خط کشیدہ یوروپین طرز ادا ہے۔

محاکات

ایک ادیب ایک مضمون نگار اور خاص طور پر ایک مؤرخ کا بہت ہی بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات و کیفیات کو ایک صفاق (فلم) کی شکل میں مرتب کرے۔ یعنی اس طرح لکھے کہ تصور کی برقیت سے ہم کنار ہوتے ہی واقعات نظر کے سامنے گردش کرتے چلے جائیں۔ اس کو فن ادب میں محاکات کہتے ہیں۔ اور محاکات سے چونکہ ایک شعریت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے تاثر مضمون بڑھ جاتا ہے۔ مؤلف تاریخ تخت طاؤس نے اس امر خاص میں نہایت کامیاب قلمرانی کی ہے۔ وہ تخت طاؤس کے موروں کی تصویر کھینچتے ہیں۔

''صناع نے ان ہر دو طاؤسان طلائی کو ایسی خوب صورتی سے دم پھیلائے ہوئے بنایا تھا کہ آمادہ رقص معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کی دموں میں اس خوش اسلوبی و حسن ترتیب سے نیلم، زمرد، فیروزے اور دوسرے جواہرات تعبیہ کیے تھے کہ دم طاؤس کا اصلی مذاق نمایاں تھا۔ ہر ایک کی چونچ میں سڈول اور یکساں موتیوں کی تسبیح پڑی ہوئی، سینہ پر ایک ایک بیش قیمت لعل جڑا ہوا جس کے گرداگرد دو دو سو گرین کے وزنی موتی جمے ہوئے گلے ہیں 63-63 رتی موتیوں کا ہار ایک ایک نورانی ہیرے سمیت جس کا وزن 117 رتی تھا آب و تاب کے ساتھ آویزاں تھا۔'' (صفحہ نمبر 101-102)۔

یا

رحلت شاہجہانی کا مرقع تیار کرتے ہیں:

''وہ شاہجہاں جس نے جامع مسجد (دہلی) بنوائی۔ وہ شاہجہاں جس نے تاج محل (آگرہ) کی تعمیر کی۔ وہ شاہجہاں جس نے دلی کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ وہ شاہجہاں جس نے تخت طاؤس پر جلوس کیا اور جلوس بھی وہ جلوس کہ جس کے باعث رعب وسطوت شاہی کا دریا حاضرین دربار کے قلوب میں لہریں لینے لگا۔ وہ شاہجہاں جو اس عالم میں بھی خدا کو نہ بھولا مگر وہ شاہجہاں جس نے حصول سلطنت کی خاطر اپنے خاندان کے کتنے ہی چشم و چراغ بجھائے، دنیا سے جاتا ہے تو کس طرح؟ دارالمکافات کی ایک تصویر مجسم بن کر، عمر کا آخری حصہ ہے۔ ایک مسجد کا حجرہ ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور ہو کا عالم ہے۔ آٹھ سال تک قید اورنگ زیب میں جھینک جھینک کر سسک سسک کر وقت کی آخری گھڑیاں ختم ہوتی ہیں اور یہ مجبوریوں کا شکار، نیرنگی عالم کا مجسمہ، تارک اورنگ ودیہم، ثانی ابراہیم اس گوشہ گمنامی میں 26/رجب المرجب 1076ھ مطابق 1666 کو اپنے رفیقۂ حیات ممتاز محل کے مقبرے پر آنکھیں جمائے ہوئے ایک آخری سانس لیتا ہے۔ اور رخصت ہو جاتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعونؒ'' (صفحہ 148-149)

اُف!! کس بلا کا درد ہے۔

کمال محاکات

ایک مصور کا کمال تو یہ ہے کہ وہ جس شے کی تصویر کھینچے وہ مکمل ہو اور ذرا بھی نوک پلک میں کمی نہ آنے پائے۔ لیکن ایک ماہر محاکات بعض پہلوؤں کو لیتا اور بعض سے سرسری طور پر گزرتا۔ بعض کو نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ تاہم اس کی قلمی تصویر مصور کے موئے قلم کی تصویر سے کہیں بالا و برتر ہوتی ہے۔

'تاریخ تخت طاؤس میں آپ کو یہ کمال قدم قدم پر ملے گا۔ اس کے مؤلف کا قلم خفیف اشارات سے وہ کام لے جاتا ہے جس کے لیے صفحے کے صفحے درکار ہوں اور شاید وہ بھی اس لطافت و

جامعیت کے ساتھ روشنی نہ ڈال سکیں۔ مثلاً:

الف۔ 'بابر نے سلطنت ہند کی داغ بیل ڈالی۔ ہمایوں نے بنیاد کھودی اور ساز وسامان جمع کیا۔ اکبر نے اس بنیاد پر عظیم الشان قصر حکومت تیار کیا۔ جہانگیر نے اس کی زیب وزینت میں عمر گزاری۔ شاہجہاں نے آرام سے بیٹھ کر چین کیے، لطف اٹھائے۔ شہرت عام و بقائے دوام کے پھریرے اڑائے۔ اور اورنگ زیب عالمگیر نے ہر کمی کو پورا کر دیا'۔ اور تو سب عبارت مولانا آزاد دہلوی کی تقلید ہے لیکن شاہجہاں سے آخر تک مولانا کشتہ کے جملہ اوّل کو لیجیے اور شاہجہاں کی پوری تاریخ مطالعہ کر لیجیے۔ اور آخری جملے کو لیجیے اور اورنگ زیب کی ساری ہسٹری دیکھ جائیے۔ پھر لطف یہ کہ 'ہر کمی کو پورا کر دیا' ایک ایسا فصیح بلیغ فقرہ ہے کہ جس میں عالمگیر کے متعلق ہر خیال وعقیدے کے انسان کے تخیل وعقیدت کی کیفیت موجود ہے۔

ب۔ نادر نے بعد مراجعت فتح ہندوستان ہرات میں ایک بہت بڑا جشن فتح و فیروزی ہند منایا۔ اور اس میں اموال واسباب مغرونۂ ہند کی ایک زبردست نمائش ترتیب دی۔ اس کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

یہ نمائش کیا تھی، ہندوستان کے خزانوں کی نمود تھی ورنہ حسن ترتیب کی آرائش وزیبائش معلوم۔ (صفحہ 154)

مخطط فقرہ، فقرہ نہیں نادر کی بربریت، وحشت اور بدمذاقی کا ایک مکمل مرقع ہے جس کا لطف کچھ صاحبان مذاق ہی خوب اٹھا سکتے ہیں۔

عیوب ونقائص

اگر میں نے سطور ہذا کا عنوان صرف 'تعارف' ہی مقرر کیا ہوتا تب تو غالباً میں یہاں تک پہنچنے کے بعد ختم کر دیتا اور کوئی مجھ پر ذرا بھی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن 'تعارف' کے ساتھ 'تبصرہ' کی قید وترکیب گویا کہلایا ہی چاہتی ہے۔ 'خوب قصیدۂ مدحیہ لکھا ہے' مگر یاد رہے، نہ تو میں تاریخ تختِ طاؤس کی دلآویزی سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ دامن کتاب کے داغ دھبے میری نظر سے

اوجھل ہو جائیں اور نہ مولانا کشتہ کی محققانہ شخصیت سے اس قدر مرعوب ہو سکا ہوں جو ان کی کوتاہیاں نمایاں کرنے سے ہچکچاؤں۔ وہ واقعات تھے اور یہ حقائق کہ۔

1۔ مولانا نے اور تو خیر کہیں نہیں مگر 'مقدمہ' میں بعض جملے بہت طولانی کر دیے جو نزاکتِ طبع پر بار ہیں۔ مثلاً صفحہ 5 کے پیرے 2 کا آخری حصہ یا صفحہ 9 کا پہلا پیرا

2۔ صفحہ 14-15 پیرا 2-1 میں بسلسلہ تشکرات 'کا' کا کی کثرت سلیم المذاقی کے کانوں پر گراں ہے۔

3۔ بعض حواشی کی طوالت خالی از مفاد نہیں مگر بیجا ضرور ہے۔ مثلاً 94-98 کے حاشیہ نمبر 5 کے ذیل میں علامہ افضل خاں کو 'غلام' لکھ دینے پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ایک غلطی کا ازالہ ہوتا ہے اور تہذیب قدیم و آئین دربار مغلیہ پر روشنی پڑتی ہے لیکن یہ مسئلہ چند سطور میں طے ہوسکتا تھا۔

یا

صفحہ 80 پر بے بدل خان کے حالات میں اس کے نام کی تصحیح ضرور ہو جاتی ہے مگر جس قدر تشریح کی گئی اس کا ایک معقول حصہ زائد از ضرورت بھی ہے۔

4۔ بعض معاصرین کے حالات حواشی میں جامع و مانع طور پر قلمبند نہ ہو سکے۔ مثلاً سعید احمد مارہروی، جادوناتھ سرکار اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد وغیرہ وغیرہ کے حالات کہ ان میں سنہ پیدائش وغیرہ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ اس معلومات کا بہم پہنچانا سہل تھا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو چونکہ یہ کتاب ایک ہسٹوریکل انسائیکلو پیڈیا، (قاموس التاریخ) کا حکم بھی یقینی طور پر رکھتی ہے، اس کی قدر و قیمت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا اور وہ مفید سے مفید ترین ہو جاتی۔

5۔ صفحہ 53 پر 'جنیر' کے متعلق قوسین میں لکھ دیا ہے 'جو سرحد نظام کی انتہا پر ہے' حالانکہ اس تشریح کی ضرورت اور تھی کہ 'اب علاقہ اورنگ آباد میں واقع ہے۔ ('علی گڑھ میگزین' علی گڑھ)

6۔ صفحہ 129 کے حاشیہ 19 میں نقار خانہ دہلی کے حالات لکھے ہیں۔مگر مناسبت موقع نقار خانۂ آگرہ کے حالات کی مقتضی تھی۔

7۔ دوایک جگہ مجھے لائق مؤلف کی رائے سے اختلاف بھی ہے۔مثلاً

(الف)۔وہ صفحہ 109 مابین حاشیہ 8 علامہ شبلی کی مختصر سوانح عمری میں رقمطراز ہیں:

''عہد حاضرہ کے ترقی یافتہ طرز 'سیرت نگاری' کے بانی تھے۔''

حالانکہ ایسا نہیں 'حیات نگاری' کے طرز جدید کے بانی علامہ حالی مرحوم ومغفور ہیں: (ملاحظہ ہو۔سیر المصنفین حصہ دوم صفحہ 371 وصفحہ 376)

ب۔ صفحہ 28 اوراس صفحہ کے حاشیہ 8 میں فاضل تاریخ نگار نے نہ صرف یہی دھوکا کھایا ہے کہ 'اردو' شاہجہاں کے دور میں وجود پزیر ہوئی بلکہ ان سے یہ لغزش بھی ہوئی ہے کہ انھوں نے صاحب شعر الہند کی اس تحقیق پر کہ اردو کواورنگ زیب کی فتوحات دکن کے عہد سے بحیثیت زبان ماننا چاہیے اعتراض کیا ہے۔حالانکہ ایک زمانہ میں وہ خود مجھ سے 'دکن میں اردو' (مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی) 'پنجاب میں اردو' (مؤلفہ محمود شیرانی) اور 'اردوئے قدیم' (مؤلفہ سید شمس اللہ قادری) کی تحقیق وتفتیش کی بہت کچھ تعریف و توصیف کر چکے اوراس کے مطالعہ کی ترغیب دلا چکے ہیں جوصاحب شعر الہند کی رائے کے برعکس مغلوں کے دور سے صدیوں پہلے 'زبان اردو' کے وجود اور اس کے بشکل زبان متشکل ہونے پر روشنی ڈالتی ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کشتہ نے ان کتابوں کواس حصۂ تاریخ کی تالیف کے بعد مطالعہ کیااور معلومات جدید کے قلم سے ان سطور کوقلمزد کرنا بھول گئے۔

ج۔ صفحہ 111 میں 'ایک نقل' کے عنوان سے لکھا ہے:

'کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ تخت طاؤس پر جلوس کرتا تھا تو یہ مور دُم پھیلا کرناچنے لگتے۔تسبیح ان کی منقاروں میں گردش کرنے لگتی اور اللہ اللہ کی صدائیں چونچوں سے برآمد ہوتیں اور ہر صدا پر ایک دانہ ہٹتا جاتا تھا' لیکن یہ نقل ہی نقل ہے۔اصل کواس

میں ذرہ بھر دخل نہیں کہ ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

ہم اس سے پہلے کہیں لکھ آئے ہیں کہ مولانا کی عبارت بہت ہی پر معنی اور ان کا چھلکتا ہوا قلم کہیں کہیں بہت گہرائیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے یہاں بھی وہ شان نمایاں ہے۔ گویا انداز بیان صاف بتلا رہا ہے کہ ان طلائی طاؤسوں کا بولنا مولانا کو اور ان مولانا کو جو 'تاریخ اسلام' کے کیڑے ہیں حیرت انگیز معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے یہ تحقیق نہیں کہ دراصل 'تخت طاؤس' کے مور بولتے تھے یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس زمانہ کے لیے یہ بھی کوئی قابل حیرت امر نہیں۔ غالبًا مولانا کو 'معین الاثار' (تاریخ تاج محل) مؤلفہ مولوی معین الدین احمد اکبر آبادی کے مستند ہونے میں کلام نہ ہوگا۔ اس میں لکھا ہے:

> ''خلیفہ المقتدر باللہ عباسی 96-282ھ نے ایک حیرت انگیز عمارت تعمیر کرائی تھی جو 'دارالشجرہ' کے نام سے موسوم تھی۔ صحن کے وسط حوض میں طلاے احمر کا ایک درخت تھا جس میں سونے چاندی کی اٹھارہ ڈالیاں تھیں۔ ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں تھیں۔ ہر شاخ میں بیش بہا مختلف رنگوں کے جواہرات اس خوبی سے مرصع کیے گئے تھے کہ قدرتی و مصنوعی پھلوں و میووں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ نازک ڈالیوں پر رنگ برنگ کے طلائی پرند تھے۔ یہ پرند اس معجز نما ترکیب سے بنائے گئے تھے کہ جب ہوا چلتی تو سب خوش الحانی سے نغمہ سرائی کرتے تھے۔''

المقتدر اور شاہجہاں کے دور میں ساتھ ساڑھے سات سو برس کا فرق ہے۔ بہر حال المقتدر متقدم تھا۔ اور شاہجہاں مؤخر۔ اس دور کے کاریگر اور صناع تھے جو خود بقول مولانا 'دربار ہند میں آ کر جمع ہو گئے تھے'۔ پھر تعجب کی بات کیا ہے؟ کیا جو دماغ بغداد میں معجز نمائی کر سکتے تھے وہ ہندوستان میں سات سو برس بعد دم مسیحائی نہیں بھر سکتے تھے؟ میرے خیال میں تحقیق سے کام لیا جاتا تو شاید کوئی مفید مطلب بات نکل آتی۔ مگر ہاں! ذرائع تحقیق و تفتیش کہاں؟ کہ

ورق بر ورق ہر سوئے برد باد (فردوسی)

لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ عیوب و نقائص نہیں بلکہ آثار بشریت ہیں، جن سے غالبًا کوئی تصنیف و تالیف خالی نہیں۔ انھیں دیکھ کر نفس کتاب اور اس کی خوبیوں کے متعلق کوئی غلط خیال قائم کرنا ایک ظلم صریح اور مؤلف کو ماورائے انسانیت سمجھنا ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی نوعیت میں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس کے ذریعہ سے قدردانانِ فن تاریخ کے لیے تنقید و انکشاف مسائل تاریخی کا ایک بیش بہا سرمایہ فراہم کیا گیا ہے۔

فاضل مؤلف نے جس ذوق سلیم اور بصیرت تاریخی اور ادبی سے کام لیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ میں زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ کوشش ادبی و تاریخی حلقوں اور علمی مجلسوں میں بہ نظر استحسان و احسان مندی دیکھی جائیگی۔

اس کتاب میں علاوہ معنوی خوبیوں کے جو تاریخ، تنقید مسائل و معلومات آئین دربار مغلیہ و آئین سلف سے متعلق ہیں، سب سے بڑا حسن اس کی پاکیزہ ترتیبی ہے۔ لطف یہ کہ کتاب باب در باب نہ ہونے کے باوجود بھی محض عنوانات کی خوش وضعی و خوش ترتیبی کے باعث واضح تر بن گئی ہے۔ ہر حصے کو بالکل جدا جدا مگر اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر ایک میں شان تکمیل موجود ہے۔ اور ایسی دل آویزی و دلچسپی پیدا کی گئی ہے کہ طبیعت خود بخود حصص آئندہ کی مشتاق مطالعہ ہوتی چلی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے بار بار پڑھنے پر بھی جی سیر نہیں ہوتا۔

مکمل کتاب (علاوہ فہرست مضامین و فہرست حواشی) 30X20/8 تقطیع کے ایک سو چونسٹھ (164) صفحات اور ستہتر (77) عنوانات پر مشتمل ہے۔ فہرست حواشی سات قسموں پر منقسم ہے۔ اول میں مشاہیر رجال جن کا تذکرہ کتاب میں آیا ہے، ان کے نام، حواشی کے نمبر سلسلہ و نمبر صفحات درج ہیں۔ دوسرے میں خواتین کے۔ تیسرے میں عمارات، باغات اور مقامات کے۔ چوتھے میں اشیا کے۔ پانچویں میں ادبی و تاریخی اصطلاحات وغیرہ۔ چھٹے میں رسوم کے۔ ساتویں میں تصاویر کے عنوانات۔ یہ ہر ایک قسم حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کی گئی ہے جو ایک دلچسپ اور مفید ترین جدت ہے اور اسی نے اس کتاب کو 'قاموس التاریخ' بنایا ہے۔

لکھائی چھپائی کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ پنجاب کے مایۂ ناز مطبع 'مفید عام' لاہور میں 'رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز' کی علمی سرپرستیوں کے زیرسایہ طبع ہوئی ہے۔ یہ پریس اردو کی خدمات اور علوم مشرقیہ کی تربیت کے سلسلہ میں ہندوستان میں وہی پایہ رکھتا ہے جو 'نول کشور پریس' لکھنؤ اور صحت کتابت حسن طباعت اور نفاست کاغذ وغیرہ میں اس سے زیادہ نمایاں ہے۔

مولانا کشتہ (مؤلف کتاب ہٰذا) کی ملازمتی مجبوریوں، عدیم الفرصتی اور علالت کے لامتناہی سلسلہ سے مجھے ذاتی طور پر واقفیت ہے اس لیے یہ موقر کتاب صحیفہ عبرت اور وقت کی قدر نہ جاننے والوں کے لیے پیغام عمل ہے۔

گو محاسن ذاتی وصفاتی کے علاوہ وہ 'تخت طاؤس' کی طرح 'تاریخ تخت طاؤس' کا سات سال میں تیار ہونا ہی ایک شگون نیک اور اس کی شہرت ومقبولیت کا پیش خیمہ ہے۔ تاہم میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اہل ملک کو جو ملک کے بہت سے ناموافق مزاج امور میں یورپ کی کورانہ تقلید کرنا اپنے لیے باعث فخر ومباہات سمجھتے ہیں اس کتاب کی روا اور جائز قدردانی کرنے میں مغربی ارباب نظر کی پیروی کرنا اور اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دینا چاہیے کیونکہ بےلوث، بے غرض اور بغیر کسی مجلس علمیہ اور بلا ارباب دُوَل کی سرپرستی کے علمی مشاغل میں مصروف رہنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اس سے بہتر تدبیر ہو ہی نہیں سکتی کہ ان کے نتائج مساعی کی قرارواقعی قدر کی جائے۔

اب میں آپ کے قیمتی وقت کو زیادہ ضائع کرنا نہیں چاہتا اور اس سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے آپ سے مرخص ہوتا اور آپ کو اصل کتاب کے مطالعہ کی جانب متوجہ کرتا ہوں۔

مورخہ 16/اکتوبر 1931 — سید ظہیرالدین احمد علوی

ایم۔اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل

مدیر رسالہ 'مشاعرہ' (فرخ آباد)

مین پوری (یو۔پی)

ضمیمہ تبصرہ و تعارف 'تختِ طاؤس'

جذباتِ لطیف

1۔ تاثرات

ہاں تڑپ جائے تڑپتا دیکھ کر قاتل مجھے بجلیاں لا دے خدارا اضطراب دل مجھے
ہے ازل سے جستجوے کوچۂ قاتل مجھے زندگی میں چاہیے آرام گاہ دل مجھے
زندگی کو میں سکون قلب پر کردوں نثار چین لینے دے جو برباد تمنا دل مجھے
خاک پروانوں کی اڑتی پھر رہی ہے بزم میں اور کیا دکھلائے دیکھوں گرمی محفل مجھے
کیا سمجھتا ہے مجھے ناآشنائے بحر غم گھورتا ہے دور سے کیوں دیدۂ ساحل مجھے
خاک مجنوں سے بنے تھے میرے اجزائے حیات روح نے محصور ہو کر کر دیا محمل مجھے
ہو گیا ظاہر مآل سوز غم افسوس ہے میرے نالوں نے کیا شرمندہ محفل مجھے
میرے خونِ شوق کے دھبوں پہ پردے ڈال دے حشر میں رسوانہ کرائے دامنِ قاتل مجھے
آشنائے بحر غم ہوں ڈوبنے میں ہے نجات
موج نے سمجھائے کشتۂ ساحل مجھے

(از ماثر الشعرا مرتبہ حضرت نصیر علوی ایل۔ ایل۔ بی، منصف مین پوری)

ہے جسم عنصری مرا وجہ فنا مجھے یہ خاک میں ملے تو ہو حاصل بقا مجھے
بخشش بقدر وسعت ہمت ضرور تھی پھر کیا گلہ جو رنج ملے ہیں سوا مجھے
چپکا کھڑا ہوں داور محشر کے سامنے آتا نہیں تمھارے ستم کا گلا مجھے
کہہ دو تم اپنے منہ سے کہ کشتہ ہے یہ مرا مل جائے کچھ تو عشق میں داد وفا مجھے

ضبطِ فغاں کی تاب کیا کیسے چھپاؤں رازِ عشق　　تارِ نفس کی لے میں ہے شورِ صدائے سازِ عشق
وجہِ قرارِ قلب ہے بیخودیِ نیازِ عشق　　حسن سکوں شکن ترا افشا کرے نہ رازِ عشق
جذب ہوئیں وہ بجلیاں ذرۂ خاکِ طور میں　　شکر خدا کہ ہو گیا حسن کو امتیازِ عشق
لطف و کرم نہ پوچھئے مجھ کو ذہین دل کیا　　دل کو ازل میں کر دیا حسن نے سرفرازِ عشق
گردشِ دل رہے سدا حلقۂ زلفِ یار میں　　ختم نہ ہو خدا کرے سلسلۂ درازِ عشق

(از رسالہ 'فانوس' جھانسی بابت جولائی 1927)

آہ و فغاں کے ساتھ جو دردِ نہاں ہے اب　　کیا کائنات عشق کا حاصل عیاں ہے اب
حدِ شکیب ٹوٹ گئی ہے فراق میں　　دھوکا ہے صرف صبر کی دنیا کہاں ہے اب؟
بالیں غم پہ روز تھی مرنے کی آرزو　　وہ آ گئے تو منتِ عمرِ رواں ہے اب
روتا ہے کون کشتۂ بیکس کی لاش پر؟　　اک ہجر کی ہے رات جو نوحہ کناں ہے اب

تھا میں سرشارِ تغافل مجھے کچھ ہوش نہ تھا　　ورنہ یہ سبزۂ تربت لبِ خاموش نہ تھا
خفتہ بختوں کی کہانی تو وہ سنتے لیکن　　محوِ آرائشِ گیسو تھے انھیں ہوش نہ تھا

یہ طلاطم خیزیِ سیلابِ موجِ زندگی　　اس میں پنہاں ہے مگر طوفانِ محشر دیکھیے

(از گلدستہ افضل، مرتبہ افضل اکبرآبادی)

ہوں شمعِ بزمِ الفت اک شب کی زندگی ہے　　ہے ابتدائے غم میں انداز انتہا کا

(از نغمۂ جھانسی)

اب تک نہ پتہ پایا اس دشمن ایمان کا　　یارب نہ کوئی مجھ سا مایوسِ تمنا ہو
للہ نہ ٹھکراؤ تم ناز سے قبروں کو　　محشر سے کہیں پہلے اک حشر نہ برپا ہو

(از اخبار عزیز ہند جھانسی)

پھر آرہا ہے اشک مسلسل کا قافلہ　　پھر ضبط دل ہے شکوۂ قاتل لیے ہوئے

طائر جاں مائلِ پرواز ہے　　آج ساماں شکست ساز ہے
آ رہی ہے کیا صدائے بازگشت　　گل چمن میں گوش بر آواز ہے
کہتی ہیں کلیاں چٹک کر باغ میں　　'دل میں جب تک ہے جب ہی تک راز ہے'
اس نے مردوں کو جلایا کہہ دیا　　'یہ کوئی اعجاز میں اعجاز ہے'
دل پہ پھر بجلی گرے گی خیر ہو　　فتنہ ساماں پھر نگاہ ناز ہے
آپ بھی رکھ دیجیے دو چار پھول　　یہ مزار کشتۂ جانباز ہے

(از عزیز ہند اخبار، جھانسی)

نظم نگاری پر توجہ کی اور 'موسم گرما کا آخری گلاب' کے عنوان سے ٹامس مور کی مشہور نظم 'لاسٹ روز آف سمر' کے خیالات کو جس کا نثر ترجمہ جناب تنہاؔ نے 'شاعرانہ خیالات' نامی کتاب میں کیا ہے، جامۂ نظم پہنایا۔ وہو ہذا۔

موسم گرما کا آخری گلاب

یادگارِ موسم گل تھا چمن میں ایک پھول　　اک ہوائے تند کے جھونکے سے مرجھایا ہوا
کچھ پریشاں حال سا افسردہ خاطر، دل ملول　　پتے پتے سے نمایاں زردیِ رنگ فنا

مجمع یاران ہم دم ہو چکا تھا منتشر　　تھے لب خاموش اس کے صد بیان مدعا
کر چکے تھے رخت ہستی چاک اس کے ہم سفر　　ہو چکے تھے ترجمان راز ہستی و فنا

نوحۂ ماتم بنا تھا شور مرغانِ بہار　　وعدہ حسن تبسم سے نہ تھا مٹنے کا ہوش
جب مٹانے پر ہوا آمادہ چرخ کج مدار　　کر دیا ٹھنڈا پیام مرگ نے نخوت کا جوش

دیکھ لی پامالی کشت چمن زار حیات　　سامنے تھیں چند روزہ عمر کی رسوائیاں
سر سے پا تک محو حیرت تھا اسیر حیات　　روکش آئینہ تاریخ فطرت چیتاں

تھی یہی برباد ہستی زینت صحن چمن　　روح فرسا ہے یہ انجام بہارِ کائنات
آج ہے یاد حوادث سے جو محتاج کفن　　ہے انھیں بکھرے ہوئے اوراق میں درس حیات

کون کر سکتا میری بربادیوں کا امتیاز　　آج تک کس کو ہوئی انجام کی اپنے خبر
سرنگوں بھی ایک دن ہوگا جو ہے گردن فراز　　آنکھ کھولی تھی کہ فطرت نے دیا حکمِ سفر

(از ایجوکیشنل گزٹ۔ جالندھر بابت ماہ مئی 1930)

2۔ مصنوعات

یوسفتاں جہاں حسن محشر دیکھیے　　جنت وصل ایک طرف ہجراں کا آذر دیکھیے
ہیں ملک سیرت غریق چاہ ژرف سامری　　جادوے بابل نمائے چشم عبہر دیکھیے
دیدنی ہے جذرومد بحر زخار و نموع　　جذب ماہ روے رخشاں سنمبر دیکھیے
اتہام پوچ گوئی ہے سخن فہمی کمال　　آئے ہر بیت میں معنی کا دفتر دیکھیے

(از گلدستہ افضل)

شور نشور ہستی ماکاں و مایکوں　　کونین میں ہے ایک فقط دل لیے ہوئے
مجروح تیرنازو ادا کے لیے نمک　　چٹکی میں ہے ملاحت قاتل لیے ہوئے
کہتے ہیں لوگ میں نے جو برتی اسدکی طرز　　'کشتہ ہے مہملات کا فائل لیے ہوئے'

یہ تمام انتخاب باستثنائے غزل

اولیں (بسلسلۂ تاثرات) وسط 1925 سے 1929 تک (دوران تعیناتی جھانسی کالج) کے کلام کا ہے۔ 1925 سے پہلے کا کلام جس میں نعتیہ حصہ زیادہ تھا نہ قلمی ہاتھ آیا اور نہ وہ رسائل دستیاب ہوئے جن میں کبھی کبھی مولانا کا کلام شائع ہوتا رہا۔

مقدمہ

آج سے بارہ برس قبل یعنی 1916 میں جبکہ میں اورینٹل کالج، رامپور (یو۔پی) کا ایک طالب علم تھا اور اضافۂ معلومات کے لیے عموماً اکثر کتبِ تاریخ وتذکرہ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، دوران مطالعہ میں نے دیکھا کہ اکثر یوروپین مصنفین اور سیاحوں نے اپنا یہ اصول بنا رکھا ہے کہ ایشائی ممالک کی صنعتوں میں جو کچھ خوبی نظر آئے اس کو کسی نہ کسی طرح یورپ سے منسوب کر دیں۔ چاہے اس سعی لاطائل میں ضمیر کے خلاف انھیں کچھ ہی کیوں نہ کہنا پڑے۔ چنانچہ اور ممالک سے قطع نظر کر کے میں نے صرف ہندوستان کی طرف نظر ڈالی تو اس کی اکثر شہرہ آفاق مصنوعات مجھے ایسی دکھائی دیں جن کے متعلق انھوں نے ان رشحات سے کام لیا ہے کہ ان کی صنعت گری میں یورپی صناعوں کی دستگاہ بہت کچھ شریک تھی۔

ادھر چونکہ اہل یورپ کی آمد آمدِ ہندوستان سلاطین مغلیہ کے دَور سے شروع ہوتی ہے اس لیے انھوں نے مغلوں ہی کی تاریخ کو کہ تاریخ اسلام کا ایک زرّین باب ہے۔ بہت کچھ غلط کیا ہے۔ اور ان کی اس طرز عمل سے صرف یہی نہیں ہوا کہ مغلوں کی ہندستانی اقوام کے ساتھ رواداری، یگانگت، اپنی ملکی صنعت کے ساتھ مقامی صنعت وحرفت کی تربیت اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی پر تاریک پردے پڑ گئے ہوں بلکہ تاریخ تمدن عالم کا سلسلہ درہم وبرہم ہو گیا۔ اور

ماہرینِ صنعت، حرفت وتعمیرات وغیرہ نے عجیب وغریب رائیں قائم کیں، جیسے کہ بعض مبصرین فنِ تعمیر کی یہ رائے ہے کہ ہندوستانِ متوسط (اسلامی ہند) کی عمارات و دستکاری میں یوروپین صنعت و دستکاری کی جھلک پائی جاتی ہے اور اس طرح خالص ایشیائی تمدن کے اجزائے ترکیبی میں خواہ مخواہ یورپ کا عنصر شریک ہوگیا۔

حالانکہ بمقابلہ دوسرے مسلم فرماں روایان ہند کے مغلوں ہی نے ہندستانی صنعت و دست کاری کی ترقی میں جلیل القدر مساعی کیں اور انھیں کے عہد میں تمدنِ ہند تمدنِ اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ کیونکہ انھیں کو زیادہ اطمینان کے ساتھ یہاں کی حکومت میسر آئی تھی۔ علاوہ ازیں خود وہ اور ان کے امرا قدر دان وقدر شناس علم وفن تھے۔ ان کی دریا دلی اور فیاضی کا شہرہ سن کر ملک ملک کے علما، شعرا اور اہلِ ہنر آتے تھے اور اپنے کمالات کے باعث سونے میں تولے جاتے اور حوصلہ سے زیادہ انعام واکرام پاتے تھے۔ اس لیے ان کا دربار عربوں، ایرانیوں، ترکوں، مصریوں، ہندستانیوں اور اقطاع واطرافِ عالم کے باشندوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ انھیں کے عہد میں اس مجمع کے درمیان اتفاق واتحاد کے دیوتا نے جو اکبر اعظم کی مونی صورت میں (کہ حقیقی بانی دولتِ مغلیہ ہے۔) وجود پذیر ہوا تھا۔ ایک عجیب وغریب ہولی کھیلی جس کی رنگین چھینٹوں سے ہر شعبۂ زندگی کچھ نہ کچھ رنگے بغیر نہ رہا۔ یعنی اس یکجائی کی بدولت رفتہ رفتہ تمدنِ ہند کے شعبہ میں تمدنِ اسلام کی کہ تمدنِ عالم کے رنگا رنگ پھولوں کا ایک موزوں گلدستہ تھا دلچسپ ونظر فریب گلکاریاں نظر آنے لگیں۔ ہم صرف چند امور کو مشتے از نمونہ خروارے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

موسیقی میں دھرپت کی جگہ قول وقلبانہ کے بہت سے راگ اور برواراگ کی لے تو حضرتِ امیر خسروؒ کے تصدق میں پہلے ہی قائم ہو چکی تھی 'درباری' نے اور بار پایا۔ مصوری وروغن کاری (آئل پینٹنگ Oil Painting) نے ایک نئی طرز نکالی جو آج تک جاذبِ نظر اور 'مغل اسکول' کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوؤں کے منہ میں ایرانی اور مسلمانوں کے منہ میں ہندستانی زبان پہنچ کر ایک نیا رنگ لائی اور اردو کہلائی جس نے کیا ہندستانی کیا ایرانی سب کی زبانوں پر دخل وتصرف حاصل کرلیا۔ انسانی رشتوں کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ پیوندوں اور درختوں سے ہندوستان

چمنستان بن گیا۔ سنگھاسن بتیسی کی پریوں اور مہابھارت کے سورماؤں کی طرح صدہا ہزارہا ہندستانی تخیلات کی شاہکاروں نے ایرانی لباس پہن لیا۔

زیور سازی، تعمیرات اور جواہر تراشی میں صدہا گوشے نکلے اور اس سلسلہ میں ایرانی تہذیب کا کہ مرقع نفاست تھی خصوصیت کے ساتھ بہت بڑا اثر پڑا۔ نور جہان نے جہانگیری وغیرہ بے شمار زیورات ایجاد و اختراع کیے جن کی نقول آج تک یورپ سے بن کر آتی اور ہمیں عدم معلومات کی بنا پر ایجادِ یورپ کا دھوکا دی جاتی ہیں۔

تمام منصف مزاج ماہرین فن تعمیر و دستکاری اس امر پر متفق ہیں کہ مغل عہد کی صنعت تعمیر و زرگری میں ہندی اور ایرانی طرز کا میل ہے اور اس طرح یہاں کی مصنوعات خالص ایشائی ذہانت، ذکاوت اور خوش مذاقی کا آئینہ ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو اکبر کے عہد میں ایرانیوں کی آمد شروع ہوتی ہے اور جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں وہ اس کثرت سے ہندوستان پہنچ جاتے ہیں کہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں کا محلّہ محلّہ خطہ ایران بن جاتا ہے۔ اور فن تعمیر وغیرہ بھی اسی رفتار کے دوش بدوش متاثر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان اثرات کا ثبوت پکار پکار کر ہمیں وہ عمارات ومصنوعات دے رہی ہیں جو اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کی یادگاریں ہیں۔ شاہجہانی عمارتوں، تاج محل، موتی مسجد (آگرہ) قلعہ معلیٰ، جامع مسجد اور دیوان خاص و عام و مثمن برج (دہلی) میں جس نفاست مذاق اور سلامت طبع کا دور دورہ ہے۔ وہ اکبری عہد میں تو بالکل عنقا ہے جس کی مثال فتحپور سیکری اور قلعہ آگرہ کے وہ محلات ہیں جو اکبر کے دورِ حکومت میں تیار ہوئے اور جہانگیری عہد میں اس کی آمد آمد کا پتہ چلتا ہے۔ جس کی تمثیل سکندرہ، ایوان جہانگیری اور مقبرہ اعتمادالدولہ (آگرہ) ہے۔ اس راز کو ایک تاریخ دان بآسانی یوں منکشف کرسکتا ہے کہ جہانگیری عہد سے خاندان اعتمادالدولہ[1] کا رشتۂ اتحاد سلاطین مغلیہ سے شروع ہوا اور اس کی نورافشانیوں نے عہدِ شاہجہانی میں یہاں تک امتیاز پایا اور ترقی کی کہ ایک ایک قریہ اس سے منور ہوگیا۔

1 اعتمادالدولہ:۔ خواجہ غیاث وزیر شاہنشاہ جہانگیر کا خطاب ہے۔ یہ تاتاری النسل اور

شیعی المذہب تھا۔ اکبر کے زمانہ میں ایران سے نہایت عسرت و پریشانی کی حالت میں ہندوستان پہنچا۔ چونکہ ہمایوں کے سفر ایران کے زمانہ میں اس کے آباؤ اجداد نے خدماتِ شائستہ انجام دی تھیں اور خود بھی قابل آدمی تھا لہٰذا اکبر نے اس کو رفتہ رفتہ دیوان بیوتات کے عہدے تک پہنچایا۔ عہد جہانگیری میں یہ خود 'اعتمادالدولہ' کے خطاب سے مخاطب ہو کر وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر پہنچا۔ اور اس کے دونوں بیٹے آصف خان اور اعتقاد خان کے خطاب پا کر امرائے شاہی میں داخل ہوئے۔ نور جہاں بیگم جو جہانگیر کی محبوبہ اور اس کے پردے میں فرماں روائے ہندوستان تھی اس کی بیٹی تھی اور اس کی پوتی بنتِ آصف خان شاہجہان کی ملکہ تھی جو ممتاز محل کے خطاب سے مخاطب ہوئی 'تاج' (آگرہ) اسی بیگم کا مقبرہ ہے۔ آصف خان شاہجہاں کے زمانہ میں 'دیوان کل' تھا۔

اعتمادالدولہ آگرہ سے بادشاہ کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے راستہ میں 1621 میں فوت ہوا۔ اس کی نعش آگرہ لائی اور جمنا کے کنارے دفن کی گئی۔ نور جہاں پہلے باپ کی قبر پر چاندی کا مقبرہ بنوانے والی تھی مگر امرا کے سمجھانے بجھانے سے باز رہی اور ایک عالیشان مقبرہ بنوایا جو 'اعتمادالدولہ' کہلاتا ہے۔ اس کے متعلق جو مشہور ہے کہ 'تاج' کے بچے ہوئے مسالہ سے بنا، غلط ہے کیونکہ وہ 'تاج' سے پہلے بنا ہے۔

اعتمادالدولہ مرزا غیاث انشا پردازی میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں وقت گزارتا تھا۔ خوش محاورہ، رنگین صحبت اور شگفتہ رو تھا۔ اس کے متعلق جہانگیر کہا کرتا تھا: 'اس کی صحبت ہزار ہا مفرح یاقوتی سے بہتر ہے'۔ اتنا سلیم النفس تھا کہ دشمن سے بھی عداوت نہ کرتا تھا۔ شہزادی وسہ ہزار سوار کا منصب رکھتا تھا۔ علم ونقارہ سے سرفراز اور حضور میں نقارہ بجانے کے اعزازِ مخصوص سے معزز تھا۔

جواہرات کی صنعت و دستکاری کے متعلق، جواہرات کو مختلف شکلوں میں تراشنے کے ساتھ سب سے اہم جو امر ہے وہ یہ کہ ان کو 'شش پہل' 'ہشت پہل' اور ایسی ہی مختلف شکلوں میں اس خوب صورتی سے کاٹا جائے کہ سطوح، زوایا اور خطوط مناسب ہندسی شکل اختیار کر لیں۔

یمنی جن کی امم عاد و ثمود کا ذکر اور ارم ذات العماد کا اشارہ کلام مجید میں بھی ہے، ایک ایسی قوم گزری ہے جس نے تمام بڑی بڑی مشہور اقوام کی طرح دنیا میں اپنی عظیم الشان یادگاریں چھوڑیں۔ یہ قوم اپنے وطن مالوف سے اٹھ کر ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران والوں سے اپنی ترقی میں ہم آغوش ہوئی اور ان قوموں کے باہم ربط ضبط سے دنیا میں عجیب و غریب صنعتیں

پیدا ہوئیں۔ 'الماس تراشی' جو یہودیوں کے لیے مخصوص ہوگئی تھی، فی الحقیقت انھیں اقوام کی یادگار ہے جن کے یہاں کان جواہر بکثرت موجود تھیں اور 'یہودیوں' ہی نے منتشر ہوکر یورپ والوں کو یہ صنعت پہنچائی۔ مسلمان (جن کو علمی، فنی و صنعتی میراث بیشتر شامیوں، کلدانیوں، یونانیوں، مصریوں اور ایرانیوں سے بادوسط ایشیا میں پہنچ کر خطاو ختن کے باشندوں سے پہنچی) جو اس مخصوص صعنت کی ترقی میں فائز المرام ہوئے ہیں، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ایرانیوں وغیرہ کی نہایت عجیب وغریب صنعتوں کے نمونے ان کے پیش نگاہ تھے جن میں ترقی کر کے انھوں نے نئی تراش خراش پیدا کی۔

ہندستانی 'جواہر تراشی' اور 'نگینہ سازی' میں پہلے ہی سے خاصہ مذاق رکھتے تھے اور جواہرات سے کھڑاؤں، چھڑی، ڈبیا اور اس قسم کی بہت سی دوسری نادر، نایاب اور قابل تعریف اشیا تیار کرلیا کرتے تھے۔

ایرانی و ہندستانی صناعوں کے میل جول نے جس طرح فن تعمیرات و خطاطی میں انقلاب عظیم پیدا کردیا اسی طرح فن جواہر تراشی، نگینہ سازی وزرگری میں بھی ان کی ہنرشناسیوں اور ترکیبوں کے رنگا رنگ جوہر نمایاں ہوئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اِس عہد میں خاص طریقے سے ہمیں مختلف نگینوں کے وصل و پیوند کی وہ زرنگار کیفیت نظر آتی ہے جو اس سے قبل قریب قریب معدوم تھی۔ 'تاج' جس کو بالکل صحیح و بجا طور پر بعض مصنفین یورپ نے 'سنگ مرمر کا خواب نوشیں' قرار دیا ہے، جس پچیکاری کی عجیب وغریب صنعتوں سے مملو ہے یا تخت طاؤس جس جواہر تراشی، نگینہ سازی اور ترصیع کا زندہ معجزہ تھا، اس کی مثالیں دنیا میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اور یہ فی الحقیقت ایرانی استادوں کی استادی کا تصدق اور ہندستانی کاریگروں کی عالی دماغی کا طفیل ہے۔

تاریخی مذاق رکھنے والے حضرات شاید یہ خیال کریں کہ مغلوں کا دربار جو ایشیائی ماہرین علم وفن کا مرکز تھا، دانایان فرنگ سے بھی خالی نہ تھا۔ پس ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کے کمالات کا اثر ہندستانی صعنت پر نہ پڑا ہو۔ ان کے جواب میں سب سے پہلے تو میں فن تعمیر کے ایک یوروپین ماہر مسٹر ہیول کا قول نقل کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں:

'مسلمانوں کے عہد حکومت میں جو عمارتیں بنیں وہ'

'ہندو کاریگروں اور دستکاروں نے بنائی ہیں'

'اور ان میں صنعت یورپ کا اثر نہیں دکھائی دیتا'

اوراس کے بعد ایک اصولی اور 'سائنٹفک' جواب دوں گا۔ جو یہ ہے کہ جب ہم 'طبقات ارض' پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں 'صخور' کی دو قسمیں نظر آتی ہیں۔

(1) صخور آبی (2) صخور آتشی

آبی صخور اکثر اوقات بالائی سطوح کے داب کی وجہ سے مصفا و مجلی ہو کر 'آتشی صخور' کے مثل منقلب ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح ایک تیسری قسم اور ظہور پذیر ہوتی ہے جو 'جواہرات' کے معزز خطاب سے مخاطب کی جاتی ہے۔ یورپ کی سطح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریب قریب تمام تر 'ازمنۂ رباعیہ' کی یادگار ہے۔ اور سوائے اس کے کہ ہسپانیہ (اسپین) کی زمین تو 'مائی و آتشی صخور' سے مل کر بنی ہے ورنہ قریب قریب تمام یورپ کی بالائی سطوح پر 'آبی صخور' پائی جاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئلہ بکثرت ملتا ہے۔ اور چونکہ جواہرات قریب قریب سب ہی 'صخور آتشی' کے لخت جگر ہیں اس لیے یہ امر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ جب اہل مغرب کے یہاں کانِ جواہر ہے ہی نہیں تو انھیں اس زمانہ ماضی بعید میں کان کنی "جواہر تراشی" یا جواہرات کے تعبیہ و پیوند کی سلیم المذاقی میں دستگاہ کس طرح حاصل ہو جاتی؟ یہ اتنا مہتم بالشان مسئلہ ہے جس کے ہوتے ہوئے مصنفین یورپ اور ان کے عقیدت مندوں کی وہ تمام توجیہات پادر ہوا نظر آتی ہیں، جو انھوں نے خالص ایشیائی مصنوعاتِ ہند کی ساخت میں اہل یورپ کی شرکت ثابت کرنے کے لیے وضع کر رکھی ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو یہ خطور ہو کہ شاہجہاں نے کوہ نور کو تراشنے کے لیے تو ہارٹینلو ربارگس کو دیا تھا، جو امسٹرڈم کا باشندہ تھا، اس لیے جواب قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ان حضرات کی تشفی کے لیے میں ایک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔

بنی اسرائیل یعنی قوم یہود نے دنیا اور دنیا کی ان تمام قوموں پر جو اُن کے قبضۂ قدرت

میں تھیں، انتہا درجہ کے مظالم توڑے اور اس لیے 'قہر ربانی' ان پر نازل ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دنیا میں 'من حیث القوم' یکجا ہو کر نہ رہ سکی۔ بلکہ منتشر ہو گئی اور اس کے افراد جہاں جہاں گئے اپنی صنعت اپنے ساتھ لے گئے چنانچہ کچھ والندہ (ہالینڈ) بھی پہنچے۔ قوم ولندیز نہایت آزاد خیال تھی۔ اس نے ان کو اپنے یہاں جگہ دی اور انھوں نے اپنی صنعت کو ہمیشہ قائم رکھا۔ یہ وہی یہودی النسل ولندیز ہیں جن کے یہاں سارے یورپ کے جواہرات اور الماس، تراش خراش کی غرض سے پہنچتے تھے۔ ان ہی میں سے کچھ لوگ شاہجہاں کے دربار تک پہنچے تھے۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں اقوام یورپ میں ولندیزی بھی بسلسلۂ تجارت ہندوستان میں موجود تھے۔ اور آج بھی یہ صنعت ہالینڈ ہی تک محدود ہے۔ اور گو اور اقوام بھی اس میں ساعی ہیں۔ مگر اب تک ان کو وہ درجہ حاصل نہ ہوا۔ اس طرح میرا مذکورہ بالا بیان قطعی صحیح ہے۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ دور حکومت مغلیہ کے 'ہندستانی مصنوعات' پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے فی الجملہ فن تعمیرات، زیور سازی اور جوہر تراشی کی ترقی، ان میں 'تمدن اسلام' کے آثار پر تبصرہ اور غلط فہمی پھیلانے والی روایات کی تنقید و تصحیح کر دی جائے تا کہ نباضان تمدن و تہذیب شاہراہ تحقیق و تفتیش میں گمراہ نہ ہوں۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میں نے تخت طاؤس اور اس سے ایک خاص تعلق رکھنے والے کوہ نور ہیرے کو انتخاب کیا کیونکہ تاج کے منظرِ عام پر واقع اور اس تک ہر کہ و مہ کی رسائی ہونے کے باعث اس پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے اور بہت سے منصف مزاج یوروپین اور ملکی اہل قلم حضرات دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھا چکے ہیں۔ لیکن تخت طاؤس و کوہ نور چونکہ عموماً خزانوں کے گوشوں میں مکتوم رہے یا دربار میں عام نظروں سے منتشر، اس لیے ان کی طرف خاص طور پر کسی نے توجہ نہیں کی اور خصوصاً تختِ طاؤس کی جانب جو انقلاب زمانہ اور حوادثِ روزگار کا شکار ہو کر تبدیل ہیئت بھی کر چکا اور اس کے رقیب شہرت، لوگوں کو عجیب و غریب مغالطے دے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اب تک اس کے حالات پر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور کچھ منتشر حالات میسر آتے ہیں وہ ہماری بیان کردہ یورپین مصنفین کی عادت مخصوص کا مظہر اتم ہیں۔

تختِ طاؤس نام سے لے کر کام تک 'خالص ایشیائی فن تعمیر، جواہر تراشی، زیور سازی، زرگری وخطاطی کا مرقع، اسلامی تمدن و 'تمدن ہند' کی ترکیب، جواہر اور نگینوں کے تعبیہ، پیوند اور ترصیع، ہندو مسلم اتحاد، مغل فرمانروایانِ ہند کی رواداری اور ہندستانی اقوام کے ساتھ ان کی یگانگت کا آئینہ اور زمانۂ متوسط ہند (اسلامی ہندوستان کی) صنعتی ترقی، سلاطین مغلیہ خصوصاً شاہجہاں کے عہد کی سلیم المذاقی، اور اپنے ہم قوموں، ہم مذہبوں اور قدیمی ہم وطنوں کی صنعت و حرفت کی تربیت کے قدم بقدم ہندستانی صنعت ودستکاری کی سرپرستی کا جام جہاں نما ہی نہیں بلکہ پائداری کے دوش بدوش نزاکت، باریکی اور موشگافی میں شہرہ آفاق تاج سے بھی کہیں بالا و برتر تھا۔ اور جو رتبہ آج تاج کو حاصل ہے کہ دور دست ممالک سے لوگ اس کی زیارت کے لیے طرح طرح کی صعوبات سفر برداشت کر کے آگرہ آتے اور اس کی سیر کو اپنے لیے باعث اعزاز و افتخار جانتے ہیں، کبھی تختِ طاؤس کو بھی حاصل تھا۔ ان وُجوہ کی بنا پر ہمارے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ بے حد موزوں ہے۔

اس تخت کے حالات کو یکجا کر دینے سے امورِ مصرحۂ بالا کے علاوہ 'آئین دربار مغلیہ' اور اپنے ملک کے بادۂ غفلت سے سرشار اس نوجوان طبقہ کے سامنے ایک مرقع عبرت بھی پیش کر دینا میرا مطمحِ نظر تھا جو ایک خاص وضع کی تاریخوں کے مطالعہ سے اپنی بصیرت کو کھوئے ہر امر میں خود کو محتاج وتلمیذ یورپ سمجھتے ہوئے پائے ہمت کو توڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا ہے۔ دفاتر کی کرسیاں اس کی معراج نظر ہیں اور تعلیم سے اس کی غرض وغایت خود کو دفتری مشین کا ایک چلتا ہوا پرزہ بنانا۔ وہ صنعت ودستکاری کی فارغ البال، مطمئن، باعزت اور آزاد زندگی کی مسرتوں کو ملازمت کی عسرت آمیز پابندیوں پر قربان کر دینا عین عقلمندی اور داخلِ وضعداری جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حالات جو اس کے بزرگوں کے شاندار کارنامۂ حیات کا مجموعہ ہیں اس کے لیے درسِ عبرت ثابت ہوں اور وہ مائل بہ صنعت وحرفت ہو کر عالم صنعت میں 'بھارت ورش' کا ایک بار پھر بول بالا کر دے۔ کیونکہ دنیا کے بہت سے لوگوں نے 'ہمارے بزرگ اور ان کے کارنامے کیا تھے؟ ہم اور ہمارے کرتوت کیا ہیں؟' کا مقابلہ کر کے دنیا میں بڑے بڑے موقر کام کیے اور حیاتِ

جاوید کا لطف اٹھایا ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

(حافظ شیرازیؒ)

میں نے کتابِ ہذا کی تیاری کے متعلق ضروری یادداشتیں تو رامپور ہی میں قلمبند کرنا شروع کر دی تھیں مگر بہت کچھ سرمایہ 'شعیب محمدیہ ہائی اسکول' آگرہ کی ملازمت کے دوران (1918 لغایت 1922) میں جمع کیا۔ اور اس معاملہ میں 'شعیب اسکول' کی مربی 'انجمن محمدیہ' کے 'اسلامی عجائب خانہ اور' کتب خانہ محمدیہ' نے میری زبردست معاونت کی۔ یہ کتب خانہ انجمن مذکور کے سکریٹری مولوی سعید احمد مارہروی (صاحب امرائے ہنود) کی خوش مذاقی اور تاریخی دلچسپی کی وجہ سے بیش بہا، نادر اور نایاب تاریخی ذخیرے پر مشتمل ہے۔

جون 1921 میں جبکہ میں بڑی سرگرمی کے ساتھ تخت طاؤس اور کوہ نور کے حالات جمع کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے 'شعیب اسکول' کی جانب سے ایک وفد میں شامل ہو کر حیدرآباد (دکن) کا سفر کرنا پڑا۔ اس سلسلۂ سفر میں مَیں نے حیدرآباد، گولکنڈہ، جالنہ، اورنگ آباد، خلدآباد، دولت آباد (دیوگری)، ایلورا اور بمبئی وغیرہ کی سیاحت کے علاوہ ان مقامات پر جہاں جہاں آثار قدیمہ، عجائب خانے اور کتب خانے تھے، ان کی بھی سیر کی۔ یہ سفر میرے پیش نظر مضمون کی تکمیل کے لیے آیۂ رحمت تھا۔ جس کے دوران میری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

1922 میں مَیں سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہو کر گورنمنٹ ہائی اسکول باندا میں تعینات ہوا۔

باندا ایک عجب بدمذاق مقام تھا کہ وہاں نہ تو کوئی شخصی کتب خانہ ہے اور نہ پبلک لائبریری۔ اس لیے قریب قریب دو سال تک میں وہاں سوائے موجودہ یادداشتوں پر غور و فکر کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا۔

مئی 1924 میں میرا تبادلہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھانسی کو ہوا۔ اور گو یہ مقام بھی

آثار علمیہ کی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا مگر پھر بھی یہاں کی بلدیہ کی قائم کردہ پبلک لائبریری اور گورنمنٹ کالج کا کتب خانہ اپنے اراکین کی خوش مذاقی کے باعث ایک تشنۂ تحقیق کی بہت کچھ پیاس بجھا سکتا ہے اور ریلوے کا عظیم الشان مقام اتصال (جنکشن) ہونے اور مختلف سمتوں میں متعدد ٹرینوں کے آنے جانے کی وجہ سے یہاں ایک بہت بڑی سہولت یہ ہے کہ ایک تلاشکار بہت سے اُن مقامات تک جہاں متعدد کتب خانے اور عجائب خانے موجود ہیں، بہت تھوڑا وقت صرف کر کے آمدورفت جاری رکھ سکتا اور وہاں کے تاریخی آثار و ذخائر سے استفادہ کر سکتا ہے۔

جھانسی پہنچ کر میرا جنون دیرینہ رنگ لایا اور میں نے گوالیار، آگرہ، دہلی، جے پور، سانچی، بھوپال، کانپور اور لکھنؤ کی خاک چھاننا اور وہاں کی لائبریریوں کی کتابیں ٹٹولنا اور عجائب خانوں میں رکھی ہوئی اشیا، تصاویر وغیرہ پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔

قصہ مختصر کوہ نور کے حالات کو ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر کے میں نے سررشتۂ تعلیمات ممالک متحدہ کے علمی و ادبی مجلّہ 'ایجوکیشنل گزٹ' لکھنؤ کے جنوری فروری نمبر بابتہ 1925 میں شائع کرا دیا۔ مگر تختِ طاؤس کی داستان تھی کہ پیچیدہ ہی ہوتی چلی جاتی تھی۔ بالآخر پرنسپل صاحب کالج کی فرمائش پر آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں سنانے کے لیے جو نومبر 1928 میں بمقام لاہور منعقد ہونے والا تھا، میں نے اس کے حالات کو ایک بسیط مضمون کی شکل میں جولائی 1928 میں مرتب کر ہی دیا۔ جس کو کانفرنس میں پڑھنے کے لیے از راہ قدردانی و حوصلہ افزائی عالی جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیمات یو۔ پی نے مجھے رخصتِ مخصوص عطا فرمائی مگر 'تدبیر کند بندہ و تقدیر زند خندہ' تواریخ اجلاس سے چند ہی روز پیشتر دفعتاً میں علیل ہو گیا اور شرکت نہ کر سکا اور اب باضافہ حواشی مجموعی طور پر کم و بیش سات سال تک تاریخوں کی ورق گردانی اور عجائب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد بدانست خود آج اس تخت کے مکمل حالات کتابی شکل میں اردو داں پبلک کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

یہ کتاب گو باب در باب نہیں اور اس کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت میں ہیں۔ مگر پھر بھی وہ سات بسیط حصص پر منقسم ہو سکتی ہے۔

(1) مختصر سوانح شاہجہاں، اس کا مذاق، تخت طاؤس بنوانے میں اس کا نقطۂ نظر

(2) ساخت اور مہتمم ساخت 'تخت طاؤس'۔

(3) ہیئت، بیانِ اجزا و تنقیدِ تصاویر 'تخت طاؤس'۔

(4) تخمینۂ مصارف۔

(5) یہ تخت کب کب، کہاں کہاں اور کس کس کے قبضہ میں رہا؟

(6) موجودہ حالت 'تخت طاؤس'۔

(7) 'تخت طاؤس' کے رقیب شہرت۔

مجھے اس تخت کے حالات قلمبند کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو کچھ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ چونکہ ہماری قدیم تاریخیں عموماً واقعات کی فہرستیں ہیں اور ان میں بے شمار تاریخی اشیا و اشخاص کے حالات اس طرح پھیلے پڑے ہیں کہ ان پر ایک نظر میں رائے قائم کر لینا اور قیام رائے کے وجوہات کو تلاش کر لینا یا واقعات کے علل و اسباب معلوم کر لینا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لیے میں نے بیشمار جدید وقدیم تاریخی کتابیں، تذکرے، رسائل، اخبارات اور یادداشتوں کو لفظ لفظ کر کے پڑھا ہے۔ ہر واقعہ کو مختلف مؤرخین قدیم و جدید کے یہاں دیکھ کر اور مختلف فیہ اُمور کے متعلق ایک معیار مقرر کر کے قائلین کے بیانات کو پرکھا ہے۔ اور پھر ذاتی قیاس و اجتہاد کے مطابق جس کو شواہد تاریخی سے سرحد یقین تک پہنچا دیا ہے، حوالہ قلم کیا ہے اور اسی سلسلہ میں جا بجا مشرقی و مغربی مؤرخین کے تاریخی اشتباہات و اغلاط کی تصحیح اور مغربی مورخین کے سرتاپا غلط بیانات کی تحقیق و تنقید بھی کی ہے اور ہر امر کی چھان بین کرنے میں حتی الوسع کمی و کوتاہی کو دخل نہیں دیا ہے۔ تب کہیں اس جامعیت کے ساتھ اس تخت کے حالات پیش کرنے میں (بخیال خود) کامیاب ہوا ہوں ۔

یوں لائے، واں سے ہم، صد دل صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا، اٹھا لیا

(لاعلم)

گو دوران تنقید میں نے خود کو غیر جانب دار رکھا ہے۔ مگر نہیں عرض کر سکتا کہ اس امر میں مَیں کہاں تک کامیاب ہوا۔

تنقید اور جمع واقعات کے ذیل میں مَیں نے عموماً امرا، درباریوں اور اس زمانہ کے مؤرخین کے بیانات کو مغربی مؤرخین اور سیاحوں کے بیانات پر ترجیح دی ہے اور جس امر میں وہ خاموش ہیں اور اس کا کسی مذہبی و سیاسی مسئلہ سے تعلق بھی نہیں ہے، قوم پرستی وجنبہ داری کا شک بھی نہیں ہوتا ہے اور قرین قیاس بھی ہے اس کو مغربی مؤرخین کے یہاں سے لے لیا اور موثق ومعتبر تصور کر لیا ہے اور چونکہ اس تاریخ کو مغل سیاسیات وہندستانی مذہبیات سے کوئی خاص تعلق نہیں اس لیے قریب قریب ایسا ہوا ہی نہیں۔ الابعض بعض ان مقامات پر جہاں مغربی مصنفین نے تعصب قومی سے ایشیائیوں کی صنعت پر پانی پھیرا ہے، ایسے مواقع پر بھی ان کے بیانات کی تردید حتی الامکان انھیں کی قلموں یا واقعات تاریخی کی بنا پر کی گئی ہے۔

بائیں صفحہ حوالہ جات دے دیے گئے ہیں اور شروع میں ان تمام کتابوں کے نام مع اسمائے مصنفین وتوضیح زبان لکھ دیے گئے ہیں جن سے یہ کتاب ماخوذ ہے۔

متن کی طرح اس کتاب کے حواشی بھی میرے حقیقی نقطۂ نظر (تصحیح وتنقید روایات مصنفین یورپ) کے مظہر ہیں، جن کی کثرت اور متن سے زیادتی بعض نازک مزاج حضرات کو غالباً گراں گزرے گی، مگر میں نے فہرست مضامین کے بعد فہرست حواشی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے گویا کتاب ہذا سے جداگانہ ایک چھوٹی سی کتاب المعارف (بک آف نالج) اس کتاب میں اور شامل کر دی ہے جو قسم در قسم فوائد تاریخی پر مشتمل ہے اور ایک ایسی زبان کے لیے جو 'انسائکلو پیڈیا' سے عاری ہو سود مند ثابت ہوگی۔ شاید میری یہ سعی ناچیز اس شکایت کو رفع کر سکے۔

اب مجھے ان احباب اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنھوں نے اس کتاب کی تالیف وتدوین میں میری امداد فرمائی۔ خصوصاً مولوی سید منظور علی صاحب ایم۔اے۔ایل۔ٹی (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول، گونڈا)، مولوی سعید احمد صاحب مارہروی (سکریٹری انجمن محمدیہ آگرہ)، مولوی میر مہدی حسین صاحب ایم۔اے، ایل۔ٹی (ہیڈ ماسٹر) اور مولوی بشارت حسین

خان صاحب آفریدی و مولوی عبدالرشید خاں صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی (اسسٹنٹ ماسٹر ان شعیب ہائی اسکول آگرہ)، سید ماجد علی صاحب درباری سی۔ٹی (اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ)، شیخ اطہر حسین صاحب قریشی، مشیر احمد صاحب علوی، ایثارالحق صاحب، کلیم الدین احمد صاحب علوی (متعلمین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا جنھوں نے ضروری مضامین کی نقلیں اور تراجم ارسال کیے۔ مولوی احسان اللہ خان صاحب ایم۔اے۔ایل۔ٹی اور بابو اجودھیا پرشاد صاحب بی۔اے۔ایل۔ٹی، مولوی ریاض علی صاحب فاضل اور مولوی افتخار حسین صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل بی (اسسٹنٹ ماسٹران گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی) کا جنھوں نے کتابیں دیکھ دیکھ کر بہت سا مواد بہم پہنچایا۔ اور مرزا علی احمد صاحب و مولوی ابوالبقا صاحب بی۔اے۔ایل۔ٹی (اسسٹنٹ ماسٹران گورنمنٹ کالج جھانسی) کا جنھوں نے ترتیب مضامین کے متعلق مجھے بہت موزوں مشورے عنایت فرمائے۔ یہ صاحبان میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ بڑی ہی ناشکری ہوگی اگر اس سلسلہ میں مَیں اپنے عزیز ترین دوست بابو سعید الزماں صاحب شرر اکبرآبادی (کلرک ریلوے اسٹور جھانسی)، بابو رفیق احمد صاحب چیف کلرک اور منشی حسین الدین کلرک محکمہ ریلوے جھانسی کا شکریہ ادا نہ کروں کیونکہ موصوفین نے مجھے بعض اہم کتابیں بہم پہنچائی تھیں۔

اس شکر گزاری کے دوش بدوش مجھے اس شکوہ نگاری پر افسوس ہے کہ بعض حضرات سے میں نے استفسارات کیے اور انھوں نے میرے سوالات پر روشنی ڈالنا تو درکنار رسید خط سے بھی شاد نہ کیا، خیر ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

(غالب)

دیکھیے ہمارا ملک کب تک ان مہذب ممالک کا ہم پایہ بنتا ہے جن کے کسی اہل علم وفن سے اگر کوئی سوال کر دیا جائے تو وہ اس کے مافیہ و ماعلیہ پر اتنی روشنی ڈال دیتے ہیں کہ سائل کو پھر

ضرورت سوال رہنا تو ایک طرف، اس کی معلومات میں بیش قرار اضافہ اور ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد میں طریقۂ پارینہ کے خلاف کتاب ہذا کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ عرض کروں گا کہ وہ اس میں جو سقم اور خرابیاں پائیں ان کی کھلی ہوئی تنقید کریں تاکہ میں اپنی کوتاہیوں سے مطلع ہوجاؤں اور ناظرین دوسرے ایڈیشن کے انتظار کی تکلیف اُٹھائے بغیر تصحیح واستفادہ کرسکیں۔

گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی (یو۔پی)　　محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری۔منشی فاضل

10/مارچ 1929　　(آنرز ان پرشین) پی۔ایل۔ای (ایڈوانسڈ ان اردو)

فہرست حوالہ جات 'تاریخ تخت طاؤس'

(الف)

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مؤلفین	کیفیت
1	آب حیات	اردو	شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی	
2	آثار الصنادید	اردو	سر سید احمد خان سی۔ ایس آئی ایل۔ ایل۔ ڈی	
3	ارض تاج	اردو	واحد یار خان اکبر آبادی۔ بی اے مدیر روزنامہ 'نئی روشنی' الہ آباد	
4	امرائے ہنود	اردو	منشی سعید احمد مارہروی۔ منیجر شعیب ہائی اسکول آگرہ	
5	اناجیل	اردو	شائع کردہ بائبل سوسائٹی اور ریلیجس بک سوسائٹی	
6	بڑی جنتری بابتہ 1894	اردو	مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد کانپور	
7	تاریخ ہند	اردو	شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ دہلوی	یہ تاریخ تیرہ جلدوں میں ہے اور ہر ایک کا نام علاحدہ علاحدہ ہے

نمبرشمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
				کتاب ہذا میں اس کتاب کی جلد ششم 'کارنامۂ جہانگیری' اور جلد ہفتم 'ظفرنامۂ شاہجہاں' سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔
8	تاریخ ہند	اردو	ڈاکٹر ایشوری پرشاد ایم۔اے رکن شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی	
9	تاریخ ہند	اردو	ای مارسڈن بی۔اے۔ سابق انسپکٹر مدارس	
10۔ الف	تاریخ آگرہ	اردو	منشی سیتل چند	
10۔ ب	تاریخ اسلام	اردو	مولوی احسان اللہ عباسی	
11	جہانگیر اور اس کی توزک	اردو	علامہ شبلی نعمانی	
12	جہان آرا	اردو	مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی۔اے، ایل۔ایل۔بی	
13	حیات صالح	اردو	منشی سعید احمد مارہروی	

نمبرشمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
14	حیات نور جہاں	اردو		
15	خیابان فارس جلد (1)	اردو	مترجمہ ظفر علی خان بی۔اے مدیر روز نامہ زمیندار لاہور	لارڈ کرزن کی کتاب 'پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن' کا نامکمل ترجمہ ہے۔
16	دربار اکبری	اردو	مولانا آزاد دہلوی	
17۔الف	سوانح اورنگ زیب	اردو	مترجمہ لطیف احمد بی۔اے ایل۔ایل۔بی	اصل کتاب 'لین پول' کی تصنیف ہے۔
17۔ب	سیر المصنفین	اردو	محمد یحیٰی تنہا بی۔اے۔ایل۔ ایل۔بی	
18	شعرالعجم	اردو	علامہ شبلی نعمانی	
19	شعرالہند	اردو	مولانا عبدالسلام ندوی	
20	عالمگیر اورنگ زیب پر ایک نظر	اردو	علامہ شبلی نعمانی	
21	قصص ہند	اردو	مولانا آزاد دہلوی	
22	قاموس المشاہیر	اردو	نظامی بدایونی	
23	مختصر تاریخ ہند	اردو	محمد عنایت اللہ بی۔اے	
24	وقائع سیاحت برنیر	اردو	خلیفہ محمد حسین صاحب	سفر نامہ برنیر کا اردو ترجمہ

رسائل اوراخبارات اردو

25 (الف) 'ایجوکیشنل گزٹ' لکھنؤ۔ بابت جنوری۔فروری 1925

26 'پیمانہ' آگرہ بابت ستمبر 1925

27 'حسن' حیدرآباد بابت نومبر 1891 (از مضمون 'حقیقۃ الالماس' مولانا تمنائی)

28 'صبح صادق' جھانسی بابت نومبر۔دسمبر 1926

29 'فانوس' جھانسی بابت جنوری 1927

30 'نیرنگ خیال' لاہور عید نمبر بابت 1922

31 'حسن' حیدرآباد عید نمبر بابت ستمبر 1890 (از مضمون 'نادرشاہ اور اس کی تعجب انگیز کامیابی سید آغا حیدر)

(ب) اخبارات:۔

32	'العدل'	بدایون=19/مارچ 1926
33	'آگرہ اخبار'	آگرہ=7/نومبر 1928
34	'ترجمان'	جھانسی=23/اکتوبر 1927
35	'ہمدم'	لکھنؤ=14/ستمبر 1925

	(ب) اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
36	آئین اکبری	فارسی	علامہ ابوالفضل	
37	اقبال نامہ۔بادشاہ نامہ	فارسی	معتمد خان ملا عبدالحمید لاہوری	
38	توزک جہانگیری	فارسی	جہانگیر۔شائع کردہ سرسید مرحوم	
39	تذکرہ سرخوش	فارسی	ملک الشعرا سرخوش	
40	تاریخ عالمگیری المعروف بہ تاریخ عاقل خان	فارسی	میر عسکری المخاطب بہ عاقل خان	

نمبرشمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
41	تاریخ فرشتہ	فارسی	ابوالقاسم۔فرشتہ	
42	جہانگیرنامہ	فارسی	جہانگیر	
43	خزانہ عامرہ	فارسی	علامہ آزادبلگرامی	
44	داستان ترکتازان ہند	فارسی	مرزانصراللہ فدائی المخاطب بہ دولت یار جنگ بہادر	
45۔الف	سیرالمتاخرین	فارسی	علامہ طباطبائی	اس کوحواشی میں کہیں کہیں 'سیر' لکھا گیا ہے
45۔ب	شاہجہاں نامہ	فارسی	عنایت خان	
47	طبقات اکبری	فارسی	نظام الدین بخشی	
48	عالمگیرنامہ	فارسی	مرزامحمد کاظم	
49	کلمات طیبات	فارسی	مجموعہ خطوط اورنگ زیب	
50	منتخب التواریخ	فارسی	ملاعبدالقادر بدایونی	
50۔الف	مآثرالامراء	فارسی	میرعبدالرزاق شاہنواز خان خوانی	حواشی میں کہیں کہیں اس کو 'مآثر' لکھا گیا ہے۔
50۔ب	منتخب اللباب	فارسی	محمد ہاشم المعروف بہ خافی خان	

لغات اردو، عربی اور فارسی جن سے کتاب ہذا میں امداد لی گئی

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
51	برہان قاطع			
52	غیاث اللغات		ملا غیاث رامپوری	
53	نفائس اللغات			
54	المنجد	عربی	باب یسوعی۔ بیروت	
55	بہار عجم	فارسی	ٹیک چند بہار	
	(ج)			
56	اورنگ زیب	انگریزی	ڈاکٹر جادوناتھ سرکار	
57	ہسٹری آف انڈیا	انگریزی	سر، ایچ۔ایم۔ایلیٹ اور پروفیسر جان ڈاوسن	یہ کتاب ایلیٹ ڈاوسن بھی کہلاتی ہے۔
58	انسائکلو پیڈیا برٹانکا	انگریزی		
59	بک آف نالج	انگریزی		
60	پرشیا اینڈ دی پرشین کوئیچن	انگریزی	لارڈ کرزن	
61	چیمبرس انسائکلو پیڈیا	انگریزی		
62	سفرنامہ ڈاکٹر برنیر	انگریزی	مترجمہ مسٹر ارونگ برُک	
63	سفرنامہ ڈاکٹر برنیر	انگریزی	مترجمہ مسٹر اے کانسٹبل	
64	گریٹ مغل	انگریزی	ڈاکٹر سرکار	
65	لیٹر مغل	انگریزی	مسٹر ولیم ارون	

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
66	لون اگزبیشن آف اینٹی کوئٹیر کارونیشن دربار 1911			
67	مڈیول انڈیا	انگریزی	مسٹر لین پول	
68	مڈیول انڈیا	انگریزی	ڈاکٹر ایشوری پرشاد	
69	منوچی اسٹوریاڈوموگور	انگریزی	منوچی	
70	ہسٹری آف انڈیا	انگریزی	مسٹر ونسنٹ اسمتھ	
71	ہسٹری آف انڈیا	انگریزی	کرنل وڈ	
72	ہسٹری آف انڈیا	انگریزی	ٹامس رو	
73	ہسٹری آف جہانگیر	انگریزی	بابو بنی پرشاد ایم۔اے	
74	ہسٹری آف انڈیا	انگریزی	مسٹر الفنسٹن	

انگریزی اور سنسکرت لغات

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
75	اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری	انگریزی	ٹی۔ڈبلیو۔بیل	
76	انسائیکلوپیڈک ڈکشنری	انگریزی		مطبوعہ کیسل کمپنی
77	ٹوانٹی ایتھ سنچری ویبسٹر ڈکشنری	انگریزی		
78	ڈکشنری فریز اینڈ فیبل	انگریزی		
79	رائل ڈکشنری	انگریزی		

نمبر شمار اسمائے کتب زبان اسمائے مصنفین ومولفین کیفیت

80	سنسکرت انگلش اسٹینڈرڈ ڈکشنری	انگریزی اور سنسکرت

انگریزی اخبارات ورسائل

81	دی السٹریڈ ویکلی آف انڈیا 15 ستمبر 1929	انگریزی
82	انڈین نیشنل ہیرلڈ	انگریزی
83	فیلڈ	انگریزی

تخت طاؤس

ہندوستان کی دلکشی

سرزمین ہند اپنی سرسبزی، شادابی، زرخیزی اور گوناگوں دلفریبیوں کی وجہ سے ہمیشہ دیگر اقوام عالم کی جاذب نظر اور اس کی تسخیر ان کا نصب العین رہی ہے۔ اور یہ اس کی دلفریبی ہی تھی کہ اسے اکثر ایشیا اور یورپ کے بادشاہوں کا جولانگاہ بنائے رہی اور جو یہاں آیا یہیں کا ہو رہا۔ لیکن چونکہ قدرت نے طبائع اور مذاق جداگانہ بنائے ہیں اس لیے ان آئے دن آنے والے فتح مندوں اور اولوالعزم بادشاہوں کی الگ الگ یادگار ایک جداگانہ حیثیت سے ہندوستان میں جلوہ فگن ہے جس سے سارا ہندوستان مملو ہے۔

سلاطین مغلیہ

چونکہ ہم شاہان مغلیہ کی ایک مٹی ہوئی یاد کو تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اور دوسرے فاتحین و سلاطین سے قطع نظر کر کے ہمارا بیان صرف اسی خاندان کے بعض فرمانرواؤں کی بابت ہوگا جن کی سطوت کا دور دورہ ہمارے موجود حکمران فاتحین سے پہلے صدہا برس تک ہندوستان میں رہ چکا ہے۔ گو زمانہ نے اپنی عادت کے موافق آج ان کا وجود اس صفحۂ ملک سے جس پر وہ صدیوں فرمانراوئی کرتے رہے تھے مٹا دیا، تاہم ان کے کارنامے ایسے نہ تھے جو ان کی عارضی ہستی کی طرح ناپید ہو جاتے۔

سعدیا! مردنکو نام نمیرد ہرگز
مردہ آنست کہ نامش بہ نکوئی نبرند

اپنی قدر دانی، صنعت نوازی اور نکتہ سنجی کے باعث ان کی سرپرستی نے علوم و فنون اور صنعتوں کے دریا بہا دیے۔ ان کے عہد کی تاریخیں، تذکرے، تصانیف، ایجادات، اختراعات، عمارتیں اور دیگر متنوع الاقسام آثار قدیمہ آج تک جبکہ انھیں خواب عدم میں سوئے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں بزبان بے زبانی ان کی تربیت علم و فن اور ان کی شوکت پارینہ کی داستان سرائی کر رہے

ہیں اور آنے والی نسلوں کے سامنے ان کی تہذیب کا مرقع پیش کر کے انھیں محو حیرت بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔

از نقش و نگار درو دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

مگر ان محامد و محاسن سے متصف اس خاندان کے تمام ہی بادشاہ نہیں گزرے۔ قابلیت، استعداد اور اہلیت وہ گراں قدر عطیے ہیں جنھیں قدرت جس دماغ میں چاہتی ہے اسی میں ودیعت کرتی ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سلاطین مغلیہ کے عروج و اقبال مندی کی مدت ڈیڑھ سو سال سے کچھ اوپر ہوتی ہے جس کے بعد زمانہ نے اپنی عادت کے مطابق کروٹ بدلی اور عالم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ مگر ان کی تہذیب و تمدن کا اثر آج تک سارے ہندوستان پر چھایا ہوا ہے۔ ان میں سے چند اولوالعزم بادشاہوں کی تاریخ کا لب لباب چند فقروں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ بابر نے تو سلطنت ہند کی داغ بیل ڈالی، ہمایوں نے بنیاد کھودی اور ساز و سامان جمع کیا۔ اکبر نے اس پر عظیم الشان قصر حکومت تعمیر کیا، جہانگیر نے اس کی زیب و زینت میں عمر گزاری، شاہجہاں نے اطمینان سے بیٹھ کر چین کیے، لطف اٹھائے، شہرتِ عام اور بقائے دوام کے پھریرے اڑائے اور اورنگ زیب عالمگیر نے ہر کمی کو پورا کر دیا۔

فی الحال ہم ان میں سے صرف شاہجہاں کے متعلق جو دودمان تیموریہ کا پانچواں فرمانروائے ہند تھا، مختصراً کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

شاہجہاں

شاہجہاں جس کا نام انتظام و انصرام، حکمرانی و فرمانروائی، رعایا پروری و عدل گستری، تربیت علم و فن، بے تعصبی و صلح جوئی اور جاہ مرتبت غرض ہر حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں

ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے۔ وہ ایک اقبال مند، نفیس مزاج، جدت پسند، جدت طراز اور طبیعت دار بادشاہ تھا۔ وہ تزک و احتشام کے ساتھ زندگی بسر کرنے، عمارتیں بنوانے اور باغات لگانے کا بے حد شائق تھا۔ تاج[1] محل (آگرہ) جو اس کی چہیتی بیگم نواب ممتاز[2] محل اور خود اس کی ابدی خواب گاہ اور عجائبات عالم میں شمار ہونے والی دنیا کی عدیم المثال عمارت ہے اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ قلعہ[3] معلیٰ، جامع[4] مسجد (دہلی) اور موتی مسجد[5] (آگرہ) جو دنیا کی حیرت انگریز عمارتیں ہیں اسی کی تعمیر کردہ ہیں۔ حیات[6] بخش، فیض بخش اور شالامار[7] نامی ہندوستان کے مشہور و معروف پُر فضا باغ اسی کی طبع رنگین کے ترتیب دادہ ہیں۔ لیکن آنی جانی دنیا میں یہ ناپائدار عمارتیں اور ان کی دلفریبیاں چلتی پھرتی چھاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اکبر نے جس کی بنیاد رکھی اور شاہجہاں نے جس بنیاد پر ایک استوار عمارت قائم کی وہ ہندو مسلم اتحاد ہے جس کے آثار ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں اردو[8] کی پاک و پاکیزہ صورت میں جلوہ افروز ہیں۔ یہ وہ خدمت ہے جس سے بڑی خدمت دنیا کے کسی تاجدار نے کسی ملک کی نہ کی ہوگی۔ نور اللہ مرقدھم۔

نوٹ۔ 1۔ تاج محل۔ تاتاریوں میں دستور تھا کہ ہر آدمی حتی الوسع اپنی زندگی میں اپنے مقبرے کے واسطے کوئی باغ پسند کرلیا کرتا تھا۔ زندگی بھر تو اس میں رہتا تھا اور مرنے پر اسی میں دفن کردیا جاتا تھا۔ شرط یہ ہوئی تھی کہ باغ جائز طور پر حاصل کیا گیا ہو۔ چنانچہ ممتاز محل کے مقبرے کے واسطے جو باغ تجویز ہوا وہ بقول مولانا آزاد، راجہ مان سنگھ اور بقول صاحب ارض تاج (واحد یار خان بی۔اے) راجہ جے سنگھ کی ملکیت تھا۔ بہر صورت وہ باغ راجگان جے پور کا تھا۔ اس باغ کے معاوضہ میں شاہجہاں نے اپنی ذاتی جائداد میں سے زمین دی اور اپنی محبوبہ کی وصیت کے مطابق یہ عدیم المثال روضہ بنوانا شروع کیا۔

صد ہا نقشوں میں سے استاد عیسی (باشندہ ایشائی ٹرکی) کا پیش کردہ نقشہ منظور ہوا۔ بغداد، دہلی اور ملتان سے معمار، سمرقند و ایشیائی ترکستان سے گنبد ساز، قنوج و بغداد سے پچہ کار، شیراز سے طغرا نویس، جے پور سے سنگ مرمر، فتح پور سیکری سے سرخ پتھر، پنجاب سے کھٹو، چین سے بلور اور پتونیا، تبت سے فیروزہ، لنکا سے نیلم، عرب سے مونگا اور عقیق، اس کے علاوہ اور قسم قسم کے پتھر اور مسالے سارے ہندوستان و وسط ایشیا کے تمام حصوں سے مہیا کیے گئے۔ بیس ہزار آدمی تقریباً 18 برس تک کام کرتے رہے۔ بقول مؤرخین ...یم پچاس لاکھ میں اور یہ

تحقیق جدید تیس کروڑ روپیہ میں بن کر تیار ہوا۔ایک ضعیف قول 1/2 4 کروڑ روپیہ بھی ہے۔

بیرونی عمارتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ناظرین کے سامنے صرف تاج کا اندورنی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

اول ایک عالیشان پھاٹک ہے۔اس کے اندر ایک بڑا چوک جس کے چاروں طرف عمارت ہے۔یہ صحن عہد مغلیہ میں کاروان سرا کا کام دیتا تھا۔یہیں غربا کے لیے لنگر جاری رہتا تھا۔ہر سال بیگم کی تاریخ وفات پر بڑی خیرات ہوتی تھی۔کچھ زمانہ ہوا اس چوک کے گرداگرد کی عمارتیں کھنڈر تھیں لیکن لارڈ کرزن آنجہانی (المتوفی 1925) اور محکمہ آثار قدیمہ کی قدردانی و مساعی نے ان کو از سرِ نو تعمیر کرا دیا ہے۔

چوک کے وسط میں شمال کی طرف روضے کا خاص دروازہ اور دروازے کے اندر اوپر جانے کا زینہ ہے جو بھول بھلیوں میں لے جاتا ہے۔آج کل اس دروازے میں بائیں جانب کے بالائی حصہ میں ایک مختصر عجائب خانہ ہے جس میں روضے کے مختلف زمانوں اور مختلف حالتوں کی تصاویر، ان پتھروں کے نمونے جو روضے میں لگے ہوئے ہیں اور قلمی نقشے وغیرہ رکھے ہیں۔

دروازے سے آگے چل کر باغ، اس کی روشیں، روشوں کے درمیان لمبے حوض اور وسط باغ میں سنگ مرمر کا ایک مربع حوض بنا ہوا ہے۔طولانی حوضوں میں فوارے اور فواروں کے بالمقابل سرو کے درخت لگے ہیں۔ باغ غرباً شرقاً 1860 فٹ اور شمال جنوب میں 1000 فٹ ہے۔جواب مغربی طور پر آراستہ ہے۔نسبت قدیم کے باعث آج تک آگرہ کے بازاروں میں میوہ جات روضے کی باغ کی طرف منسوب کر کے فروخت کیے جاتے ہیں اور لوگ بہ شوق خریدتے ہیں۔

خاتمہ باغ پر چار فٹ اونچا چبوترہ ہے جس کے اوپر مقبرہ ہے۔چاروں گوشوں پر چار مینار ہیں۔ان میناروں کے متعلق کسی یورپین نے کہا ہے 'چار بلند قامت اور حسین خواصیں ہیں جو ممتاز محل کی خدمت کے لیے کھڑی ہیں'۔مولوی غلام امام شہید نے بھی روضہ تاج گنج کی تعریف کرتے ہوئے کیا خوب شاعرانہ فقرہ ان میناروں کے متعلق تحریر کیا ہے۔'مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہیں کہ یہ خم دیکھیے اور اس عمارت کی ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھیے'۔گو میناروں پر جن میں مارپیچ کا زینہ بنا ہے چڑھنے سے سانس ضرور پھول جاتی ہے لیکن شہر کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔یہ چبوترہ 313 فٹ مربع ہے۔میناروں کی بلندی سطح باغ سے 1/2 162 فٹ

ہے۔اور خاص روضہ کی عمارت 186 فٹ مربع بنی ہوئی ہے۔روضہ کے چاروں طرف 1/2 66 فٹ اونچی محرابیں ہیں۔ان کی چوٹیوں سے محرابیں 26 فٹ رہ جاتی ہیں۔وسطی گنبد کا قطر 58 فٹ ہے۔اور اس کی چوٹی سطح زمین سے 1/2 213 فٹ۔گویا گنبد کے مقابلہ میں میناروں کی بلندی تقریباً =3 / 2 ہے۔گنبد پر جو کلس ہے 30 فٹ لمبا ہے۔دونوں بازوؤں کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ جو چوب قلم سے لکھا ہے۔اس کی تحریر طلسمی تحریر سے کم نہیں کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے ویسا ہی دور سے دکھلائی دیتا ہے۔گنبد کے اندر وسط میں ممتاز محل اور اس کے پہلو میں مغرب کی جانب شاہجہاں کی قبر ہے۔بیگم کی قبر پر 1040ھ اور بادشاہ کی قبر پر 1076ھ لکھا ہوا ہے۔جو علی الترتیب 1631 اور 1666 عیسوی کے مطابق ہے۔اگر اس روضہ میں کوئی نقص و عیب ہے تو صرف یہ کہ ہر ہر جگہ تو جواب کا خیال رکھا گیا ہے لیکن تعمیر مقابر میں یہ امر مدنظر نہ رہا۔بیگم کی قبر ٹھیک وسط میں بنی تھی۔شاہجہاں کے بعد میں دفن ہونے نے یہ بات پیدا کر دی) اوپر صرف تعویز ہیں اصلی قبریں تہ خانے میں ان کے نیچے ہیں۔تعویزوں کے گرد جو پتھر کی جالیاں لگی ہیں باوجود استادان فن تعمیر کے مجمع اور مسالے کی فراوانی کے دس برس میں تیار ہوئی تھیں اور بجائے ان کے شروع میں طلائی مرصع بجواہر جالیاں لگائی گئی تھیں۔جب یہ جالیاں بن گئیں تو طلائی جالیاں علاحدہ کر دی گئیں۔ممتاز محل کی قبر پر ایک موتیوں کی چادر جس کی قیمت لاکھوں روپیہ تھی پڑی رہتی تھی۔کہتے ہیں اس کو امیرالامرا حسین علی خان (المتوفی 1132ھ) 1720 میں لوٹ کر لے گیا۔

اخبار 'فرشتہ' آگرہ اپنی اشاعت مورخہ 21 /فروری 1926 میں رقمطراز ہے۔'لارڈ ریڈنگ اور لیڈی ریڈنگ نے حال ہی میں ہز ہائینس مہاراجہ بردوہ کے جواہر خانے کو دیکھا۔تحفۂ نادر اور بیش قیمت جواہر کی ایک چادر دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی دیکھی جو سراسر موتیوں سے بنائی گئی ہے۔سونے چاندی کی لڑیوں میں موتی گندھے ہوئے ہیں۔اس کی قیمت 30 لاکھ روپیہ ہے۔ہندوستان کے کسی بادشاہ نے رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار پُر انور پر چڑھانے کے لیے بنوائی تھی۔تاریخ دان حضرات سے التماس ہے کہ وہ اس کا پتہ چلائیں۔یہ تو ظاہر ہے کہ مرہٹوں نے انگریزی فتنے کے دوران میں اس پر قبضہ کیا ہے۔اور آخرکار یہ گائیکوار کے پاس پہنچ گئی۔میں مورّخ نہیں البتہ فن تاریخ سے ذوق ضرور رکھتا ہوں۔یہ مجھے معلوم نہیں کہ میرا مذاق تاریخ بینی صحیح ہے یا غلط بہر حال میں نے بہت سے امراؤ سلاطین تیموری کی ساختہ اشیائے نذرانہ مقامات مقدسہ دعتبات عالیات کے

حالات دیکھے ہیں۔ لیکن اس قسم کی کسی چادر کے حالات میرے نظر سے نہیں گزرے۔ عجب نہیں ہے کہ یہ وہی چادر ہو جس کو امیر الامرا حسین علی خاں کا تاج محل سے لے جانا بیان کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں جبکہ سادات بارہہ و فرخ سیر (المتوفی 1719) سے بگاڑ تھا۔ امیر مذکور کے علاوہ راجگان جے پور، جاٹ اور مرہٹے وغیرہ بھی شورش مچا رہے تھے۔ اسی گڑبڑ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ راجہ موصوف کے قبضہ میں پہنچ گئی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید مذکور نے بذات خاص اس چادر کو غارت نہ کیا ہو بلکہ اسی کے سلسلہ والی بغاوت میں لٹی ہو اور اس کی نسبت سے ان کے نام پر اس کی لوٹ لکھی گئی ہوگی اس لیے کہ سرغنہ وہی تھا۔

روضہ میں چاندی کے دو دروازے بھی تھے، انھیں 1764 میں جاٹ لوٹ کر لے گئے اور انھوں نے گلا ڈالا۔ علاوہ ازیں لاکھوں روپیہ کا سامان مثل قالین، طلائی قنادیل و شمع دان وغیرہ کے بھی رہا کرتا تھا۔ میں نے ایک کتاب موسومہ 'ہفت عجائبات عالم' میں دیکھا۔ اس میں لکھا تھا 'صناع نے گنبد کو اس خوبی سے بنایا ہے کہ ہر بارش میں ایک قطرہ آب باراں کا بیگم کی قبر پر گرتا ہے' لیکن کسی معتبر تاریخ سے اس کی سند نہ ملی جس کی بنا پر میں قدیم زمانہ کے خوش غپ حضرات کا اس کو شگوفہ طبعی سمجھتا ہوں۔

دنیا بھر کو آگرہ پر اس عمارت کی وجہ سے رشک آتا ہے۔ سات عجائبات عالم میں مشہور ہیں۔ مگر وہ سب اس ایک کے آگے گرد ہیں۔ یورپ والے اسی تمنا میں مرے جاتے ہیں کہ کاش انھیں اس کے معمار ہونے ہی کی عزت میسر آجائے۔ چنانچہ بہت سی روایتیں بھی گڑھ لی ہیں۔ بات بناتے ہیں لیکن بنائے نہیں بنتی۔ غور کیا جائے اور مقبرۂ ہمایوں دہلی کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس عمارت کا خیال یہیں پیدا ہوا، یہیں بڑھا۔ جس خیال کی ابتدا ہمایوں کا مقبرہ تھا اس کی انتہا تاج ہے۔

اہل امریکہ اس کی تمثیل کی دھن میں عرصہ سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں مستقبل قریب میں ایک نمائش ہونے والی ہے جس میں ساٹھ لاکھ ڈالر (2 کروڑ 34 لاکھ روپے) کے صرف سے 'تاج محل' کا نمونہ بنا کر دکھایا جائے گا۔ اس کا ٹھیکہ 'انڈین ٹریڈنگ کمپنی' نامی ایک ہندستانی شراکت کو دیا گیا ہے۔

تاج محل میں مسجد اور تسبیح خانہ بھی ہے۔ مسجد کے جنوب میں ایک برج ہے جس میں باولی بنی ہے۔ مسجد کے شمال میں جو برج ہے 'بسنی برج' کہلاتا ہے۔ مسجد کا جواب بنانا ضرور تھا۔ الٹی مسجد ہو نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا مسجد مثال عمارت بنا کر تسبیح خانہ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس کے صحن کے چبوترے پر اتر کی جانب روضہ کے کلس کا پورا

خا کہ سنگ سیاہ سے بنا ہوا ہے۔

روضہ کے شمال میں زیریں چبوترے پر دو زینے بنے ہیں جو تہ خانہ میں اتر گئے ہیں۔ ایک سے دوسرے میں آ جا سکتے ہیں۔ مگر بہت ہی تنگ و تاریک ہیں۔

دریا کے اس پار ایک عمارت کے کچھ مٹے مٹے آثار دکھلائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں شاہجہاں نے اپنے لیے اس پار مقبرہ بنوانا شروع کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پل بنا کر دونوں عمارتوں کو ملا دے (میں نے بھی سنا ہے کہ وہ اس دوسری عمارت کو سنگ سیاہ کی بنانا چاہتا تھا) مگر دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ جب شاہجہاں کا انتقال ہوا تو بعض امرا نے عالمگیر سے کہا۔ 'مرحوم کی خواہش تھی کہ روضہ ممتاز محل کے بالمقابل، دریا کے اس پار دفن ہوں۔ عالمگیر نے جواب دیا۔ 'میرے ماں باپ چکوا چکوی نہیں ہیں جو ایک اس پار اور دوسرا اس پار رہے یہ کہہ کر حکم دیا: ''قبر ممتاز محل کے پاس قبر بنائی جائے۔''

مسجد کے جنوب میں چبوترے سے اتر کر وہ جگہ ہے جہاں ممتاز محل کی نعش ابتدا سپرد زمین ہوئی تھی۔ باغ کے مغربی جنوبی گوشے میں ایک مکان ہے جس میں درخت ہیں۔ اسی گوشے میں دالان کے اندر ایک اور مکان ہے جس میں عجیب و غریب درخت دولت برطانیہ نے لگائے ہیں۔ پشت مسجد پر ایک باغ ہے جس میں اب پَو دتیار کی جاتی ہے۔ روضہ کی پشت پر جمنا بے فائدہ سر ٹکرایا کرتی ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ آگرہ کی مشہور عمارت اعتماد الدولہ جو نور جہاں کے باپ مرزا غیاث بیگ الخاطب بہ اعتماد الدولہ (المتوفی 1622) کا مقبرہ ہے، وہ تاج محل کے بچے ہوئے مسالے سے بن کر تیار ہوئی ہے، غلط ہے کیونکہ اعتماد الدولہ کی عمارت پہلے بنی ہے۔ اور اسے نور جہاں نے دو برس میں بنوایا ہے اور وہ 1628 میں بن کر تمام ہوئی ہے۔ یہ ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ شاہجہاں نے یہ خیال کر کے کہ ایک وزیر کا مقبرہ تو اتنا شاندار ہو لہٰذا میری محبوبہ بیگم کا مقبرہ بہت ہی عمدہ ہونا چاہیے، اس کو اتنا عجیب و غریب بنوایا ہوگا۔

تاج محل کے جائے وقوع کے متعلق ابھی کچھ اور عرض کرنا ہے۔ اس عمارت کے جائے وقوع پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے یہ خیال کر کے وہاں بنوائی تھی کہ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے۔ سمن برج (ثمن برج) آگرہ کی عمارت قلعہ میں نور جہاں کے رہنے کے لیے مخصوص تھی۔ بعد میں ممتاز محل بھی اسی میں رہی۔ ممتاز محل کے مرنے کے بعد شاہجہاں نے بذات خود وہیں رہنا شروع کر دیا تا کہ اس کی محبوبہ کا مقبرہ اس کی آنکھوں

کے سامنے رہے۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے پر وہ قطعی وہیں رہا۔ اور تاج کا نظارہ کرتے کرتے جاں بحق تسلیم ہوا۔ گویا تاج محل اس خوبی و مناسبت سے بنایا گیا ہے کہ بمقابلہ اور حصص قلعہ کے وہ ثمن برج سے بخوبی نظر آتا ہے۔ اس روضہ کی مرمت، خدام کی تنخواہ اور بیگم کی ختم فاتحہ کے خرچ کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے دیہات اور دو لاکھ سالانہ آمدنی کی دکانیں اور سرائیں (جو اس کے گرداگرد بنائی گئی تھیں اور جن سے مل جل کر یہ ایک چھوٹا موٹا شہر بن گیا تھا۔ اور جس کا نام ممتاز آباد، ممتاز محل کے نام پر رکھا گیا تھا) بادشاہ نے وقف کر دی تھیں۔ یہ آبادی اب تاج گنج کہلاتی ہے۔ یہاں تھانہ، شفاخانہ، ڈاکخانہ اور پرائمری مدارس منجانب دولت برطانیہ موجود ہیں۔

یہ عمارت محکمہ آثار قدیمہ کے تحت انتظام میں ہے۔ برابر مرمت وغیرہ کا کام جاری رہتا ہے۔ حکومت نے شہر آگرہ و تاج گنج کے درمیان ہولناک اور غیر آباد ٹیلوں کو جابجا سے ہموار کر کے اعلیٰ درجہ کا ایک باغ ترتیب دیا ہے۔ بہشت ارضی کا راستہ حقیقتاً انتاہی پُر بہار ہونا چاہیے تھا۔ اب بھی سالانہ عرس بادشاہ کا ہوا کرتا ہے جس کے مصارف سرکار انگلشیہ سے مرحمت ہوتے ہیں۔ اس عمارت پر یہ شعر فی المثل صادق آتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ‏ ‏ ‏ ‏ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

(ماخوذ از سیر المتاخرین، بادشاہ نامہ، ٹریول انڈیا لین پول، سفرنامہ ڈاکٹر برنیر، ترجمہ خلیفہ سید محمد حسین مع حواشی اور ارض تاج واحد یار خان بی۔اے)۔

نوٹ۔2۔ ممتاز محل۔ ارجمند بانو بیگم نام، نواب ممتاز الزمانی ممتاز محل خطاب، قدسیہ بیگم اور نواب عالیہ بیگم مشہور یمین الدولہ آصف خان، خان خانان، مرزا ابوالحسن بن اعتماد الدولہ، مرزا غیاث بیگ طہرانی کی بیٹی تھی۔ یہ مشہور و معروف بیگم دیوانجی بیگم بنت خواجہ غیاث الدین قزوینی (بن آقا ملا مصاحب شاہ طہماسپ صفوی) کے بطن سے 1000ھ مطابق 1552 میں پیدا ہوئی۔ سلسلہ نسب کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ نور جہاں کی بھتیجی اور اعتماد الدولہ کی پوتی تھی۔ حسب سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ کے توسط سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ 19 سال 21 دن کی عمر میں جب شاہجہاں کی عمر بحساب شمسی 20 سال ایک مہینہ اور 8 دن کی تھی۔ ربیع الاول 1021ھ میں اس کے ساتھ بیاہی گئی۔ تمام مراسم اعتماد الدولہ کے گھر میں ادا ہوئے۔ جہانگیر بہ نفس نفیس خود اس بزم عروسی میں شریک تھا۔ 5 لاکھ روپیہ کا مہر قرار پایا تھا۔ گو اس سے پہلے شاہجہاں کی شادی شاہ اسماعیل صفوی بادشاہ فارس کی پردتی کے ساتھ ہو چکی تھی اور اس کے بعد بھی اس نے اپنے اسلاف کی

طرح متعدد شادیاں کی تھیں۔ لیکن بیگمات میں جو عزت و توقیر ممتاز محل کی تھی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ بیگم چودہ مرتبہ حاملہ ہوئی۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں ہوئیں جن میں سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں اس بیگم کے مرتے دم تک زندہ رہیں۔ آخری مرتبہ ذیقعدہ 1040ھ میں گوہر آرا بیگم کی ولادت پر بمقام برہانپور وفات پائی۔ تاریخی روایت ہے کہ جب بچی کی ولادت کا وقت قریب آیا تو اندر تجربہ کار دائیاں اور باہر اطباے حاذق جمع ہوئے۔ دفعتہ پیٹ کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ سب سن کر نہ صرف حیران رہ گئے بلکہ سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ بیگم نے اپنی بڑی بیٹی (بیگم صاحبہ) کے ذریعہ سے خود بادشاہ کو طلب کیا۔ بادشاہ زندگی سے مایوس بیگم کے پاس پہنچا۔ ممتاز محل نے آہٹ پا کر آنکھیں کھول دیں اور بادشاہ کو بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ شاہجہاں سے اپنی پیاری بیگم کا یہ حال دیکھ کر ضبط نہ ہوسکا اور بے اختیار اس کے آنسو ٹپک پڑے۔ بیگم نے دو وصیتیں کیں:۔

(1) یہ کہ اس کی قبر پر ایسی بے نظیر عمارت بنوائی جائے کہ عالم میں یادگار رہے۔

(2) یہ کہ بادشاہ دوسری شادی نہ کرے کیونکہ بچے پریشان ہوں گے۔

ان وصیتوں کے بعد جبکہ اس کی نظر اپنے جان نثار رفیق زندگی کے روئے تاباں پر جمی ہوئی تھی اس کے مرغ روح نے عالم قدس کی طرف پرواز کی۔ اس وقت اس کی عمر 39 سال 4 مہینے کی تھی۔ شاہجہاں کو ممتاز محل کے انتقال کا سخت ملال ہوا۔ دو برس تک اس نے رنگین کپڑا نہ پہنا۔ عطر و خوشبویات سے محترز رہا۔ ترتیب جشن و اعیاد موقوف رہی۔ سماع جو اُس کی زندگی کا جزو لاینفک تھا ترک کر دیا۔ چند ہی دنوں میں صدمے کی وجہ سے اس کے بال سفید ہو گئے۔

ممتاز محل کی لاش پہلے باغ آہو خانہ (المعروف بہ باغ زین آباد) واقع برہانپور میں دریائے تاپتی کے اس پار امانتاً سپرد زمین کی گئی۔ بے بدل خان نے تاریخ کہی ۔

<u>جائے ممتاز محل جنت باد</u>

1040ھ

6 مہینے کے بعد 17/ جمادی الاول 1041ھ کو مرحومہ کی نعش شاہزادہ محمد شجاع، جہاں آرا بیگم، وزیر خاں اور صدر النسا ستی النسا خانم (اخت طالب آملی) کی معیت میں دارالخلافہ آگرہ کی طرف منتقل ہوئی۔ برہانپور سے آگرہ تک بیشمار روپے اور مختلف قسم کے کھانے غربا میں تقسیم کیے گئے۔ چونکہ مقبرے کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی

اور مدفن نامکمل اس لیے مسجد روضہ کے جنوب کی طرف (چبوترے سے اتر کر) باغ میں دوبارہ امانتاً مدفون کی گئی۔ اور 15 رجمادی الثانی 1041ھ کو اپنی اصلی جگہ پر دفن ہوئی۔ ممتاز محل کا مقبرہ جو 'تاج محل' یا 'تاج' یا 'تاج بی بی کا روضہ' یا 'روضہ' کر کے مشہور ہے، دنیا کی بے مثل، عدیم النظیر اور ایک ایسی عمارت ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور مختلف مذاہب اور ممالک کے سیاح اس کے دیدار کو اپنے لیے سرمایہ صد نازش و افتخار سمجھتے ہیں۔

ممتاز محل ایک نہایت درجہ حسین، ادب شناس، مراتب پرستاری سے بخوبی واقف، قابل اور روشن دماغ بیگم تھی۔ اس کی فیاضی و رحم دلی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس نے صدہا مفلس و نادار لوگوں کی لڑکیوں کی شادیاں اپنے صرفے سے کرادیں۔ بیشمار محتاجوں کو مالدار و صاحب ثروت بنادیا۔ ہزاروں مجرموں کو جو سزائے موت کے سزاوار تھے رہائی دلوائی۔

وہ بڑی ذکی، فہیم اور صائب الرائے عورت تھی۔ یہی وجوہ ہیں جن کے باعث شاہجہاں کو ایک لحظہ کے لیے اس کی جدائی گوارا نہیں ہوتی تھی۔ سفر، حضر، رزم، بزم، غرض ہر جگہ اور ہر حال میں وہ اس کی رفیق و ہمدم ہوتی تھی۔ خوفناک حالتوں میں وہ بادشاہ کو بہت عمدہ رائیں دیا کرتی تھی۔ اس جلیل القدر بادشاہ کے بہت سے مشہور و معروف کارنامے اسی سنجیدہ بیگم کے قیمتی اور قابل قدر مشوروں کے مرہون منت ہیں۔

یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ اس مشہور عصر و شہرہ آفاق بیگم کی تعلیم و تربیت کی خدمت کن ستودہ صفات و لائق ستائش ہستیوں کے حصے میں آئی تھی۔ لیکن اس کی موزون طبعی، حاضر جوابی، طالبائے آملی کی بہن صدرالنسا ستی النساخانم کا اس کی بارگاہ میں منصب مصاحبت پر سرفراز ہونا وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ لائق و یکتائے روزگار ماں باپ نے چہیتی اور لاڈلی بیٹی کو شہنشاہ ہند کی رفیقہ حیات بنانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ پھر یہ اس گھر کی بیٹی تھی جس گھر کی علمیت، قابلیت اور دانائی ہمیشہ کنیز بنی رہی۔ اعتمادالدولہ، آصف خاں، دیوانجی بیگم اور نور جہاں بیگم وہ مقتدرہ ہستیاں تھیں جن کے علم و فضل کی تعریف میں ایک عالم رطب اللسان ہے۔ اس گھرانے کی لڑکی جو کچھ بھی نہ ہو تھوڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مؤرخین قدیم کسی شخص کی زندگی پر ہر ہر پہلو سے یکجائی بحث نہیں کرتے اور اکثر عام حالات کو نظر انداز کرنے کے عادی ہیں۔ جو موجودہ زمانے کے مؤرخین کی نظر میں اگلے زمانہ کی تہذیب سے آشنائی بہم پہنچانے کے لیے ایک رہبر کامل کا کام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس بیگم کی تعلیم، تربیت علم و فضل کے متعلق قلم اٹھانے سے معذور ہیں۔ اور صاحب کتاب 'جہاں آرا' کی نوشتہ چند سطور اور ایک

واقعے کے قلمبند کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے فہیم، سنجیدہ اور باذوق حضرات بہت کچھ کھوج لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ کتاب مسطور کے مصنف نے بھی اسی طرح صدہا کتابوں کی ورق گردانی کرکے ایک ایک جملہ ڈھونڈ کر اس کتاب کو جمع کیا ہے جس طرح آج کوئی اور بیٹھا ہوا کر رہا ہے۔

وہ لکھتے ہیں 'ارجمند بانو (ممتاز محل) زیور علم و فضل سے آراستہ تھی۔ شعر و سخن میں بھی اس کو دخل تھا۔ ایک مرتبہ شاہجہاں جمنا کے کنارے تفریح طبع کی غرض سے بیٹھا ہوا تھا اور قدرت کے دلکش مناظر کی سیر کر رہا تھا۔ اس موقع پر بیگم بھی وہاں جلوہ گر تھی۔ شاہجہاں نے دریا کی موجوں کی طرف اشارہ کرکے ممتاز محل سے کہا۔

'آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگ ہا'

ممتاز محل نے برجستہ کہا۔ از ہیبت شاہ جہاں سرمی زند برسنگ ہا'

عہد حاضرہ کے ایک مشہور مؤرخ کی تصنیف کردہ 'تاریخ ہند' میں جو ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے مدارس میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے اس بیگم کے متعلق لکھا ہوا دیکھا 'وہ بڑی پکی مسلمان تھی اور غور کرنے پر معلوم ہوا کہ فاضل مؤرخ نے لفظ 'مسلمان' بطور ہجو ملیح 'شمشیرزن' یا 'سفاک' کے معنوں میں استعمال کیا تھا جو ایک صریح غلطی اور بیجا الزام ہے۔ میری رائے میں مصنف موصوف کی رائے اس لیے چشم پوشی کے قابل ہے کہ انھوں نے اہل مغرب کا تتبع کیا ہے لیکن اس لیے وہ قابل گرفت ہیں کہ انھوں نے باوجود یہ کہ ان کی آنکھیں نئی روشنی سے منور تھیں، اہل مغرب کی تقلید کو روش کی ہے۔ ان کا ماخذ غالباً منوچی کی کتاب موسومہ 'منوچی اسٹوریا ڈوموگور' ہے۔ منوچی کے متعلق اس زمانہ کے مشہور و معروف مؤرخ عالی جناب بابو جادو ناتھ صاحب سرکار بالقابہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'اورنگ زیب' میں تحریر فرماتے ہیں: ''ایک معمولی کم علم آدمی تھا، بہت ہی ستم رسیدہ تھا۔ اس نے بہت سی باتیں زمانہ ماقبل کی لکھی ہیں۔ اور وہ بھی صرف یادداشت سے۔ اس نے بہت سی باتیں خلاف قیاس و برعکس واقعات بھی لکھی ہیں۔ اس واسطے ہم اس کی باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے۔'' منوچی کی کتاب اس لیے بھی ہر معاملے میں خصوصاً شاہجہاں وغیرہ کی ذاتیات کے متعلق ماخذ بنانے کے قابل نہیں کہ اس کے ہم قوم اور ہم مذہب پرتگیزی (پرتگالی) شاہجہاں کے ہاتھوں اور بقول مسٹر اسمتھ ممتاز محل کے اشارے سے قتل و غارت کیے گئے تھے۔ وہ اگر ممتاز محل اور آل تیمور کو متہم نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ رہا شاہجہاں سو قوم مذکور کی تباہی کے معاملے میں اس کی نظر ہندو مسلم قوم کے مفاد پر تھی، سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا یہ فعل کسی پہلو سے نکتہ چینی کے قابل نہیں۔ اس قسم کی غلط

روایات دو ہندی بھائیوں (ہندو مسلمانوں) میں باہمی تنافر وتفریق کا باعث ہوئی ہیں۔ اول تو ہمیں سرکار موصوف کا اتباع کرنا چاہیے کہ زیادہ تر اسی زمانہ کے مؤرخوں کی تاریخوں، درباریوں اور حاشیہ نشینوں کی تصانیف سے استخراج واخذ واقعات کریں ورنہ پھر ان منصف مزاج اور محقق اہل مغرب کی کتابوں کو ذریعہ معلومات بنائیں جو اظہار صداقت میں اپنے اور پرائے کا امتیاز نہیں کرتے۔ بے تکلفی کے ساتھ اپنے عیوب کا اعتراف اور دوسرے کی خوبیوں کا اقرار کر لیتے ہیں (بامداد تاریخ ہند مصنفہ مسٹر اسمتھ، تاریخ ہند مصنفہ بابو ایشوری پرشاد ایم۔اے، تاریخ ہند مصنفہ اے مارسڈن صاحب بی۔اے، تاریخ ہند جلد ہشتم شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرحوم۔ مآثر الارا۔ سیر المتاخرین۔ بادشاہنامہ ملا عبدالحمید لاہوری۔ جہاں آرا مصنفہ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی۔اے وکیل، اورنگ زیب مصنفہ پروفیسر سرکار بالقابہ۔)

نوٹ نمبر 3۔ قلعہ معلیٰ (دہلی) شاہجہاں نے اپنے جلوس کے بارھویں سال مطابق 1048ھ (1638) میں شاہجہاں آباد (دہلی جدید) کی آبادی کا حکم دیا۔ 12 ذالحجہ کو یہ قلعہ بننا شروع ہوا۔ استاد حامد اور احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے اس کی تعمیر کے لیے مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اس کا اہتمام ملا۔ پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مسالہ جمع ہوا اور کہیں کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہو آئی۔ پھر الہ وردی خان کو یہ کام سپرد ہوا۔ اور دو برس ایک مہینہ گیارہ دن میں قلعہ کے سب طرف کی دیوار 12-12 گز اونچی ہو گئی۔ پھر مکرمت خاں کے سپرد انتظام کیا گیا۔ بیسویں سال جلوس یعنی قریب نو برس کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ 24 ربیع الاوّل 1058ھ (1648) یعنی تخت نشینی کے اکیسویں سال میں بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ قلعہ ہشت پہل بنا ہے۔ اس کا طول ایک ہزار گز، عرض چھ سو گز ہے۔ قلعہ آگرہ سے گویا دوگنا ہے۔ اس کی فصیل 25 گز اونچی اور بنیاد 11 گز گہری ہے۔ دیوار کا آثار بنیاد سے پندرہ اور اوپر سے 11 گز کا ہے۔ اس کی خندق 24 گز چوڑی اور 10 گز گہری بنی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپے صرف ہوا ہے۔ بقول صاحب مرأت آفتاب نما ایک کروڑ روپے لاگت آئی جس میں سے پچاس لاکھ تعمیر قلعہ میں اور پچاس لاکھ اندر والے محلات وغیرہ کی تعمیر میں خرچ ہوا ہے۔ اس قلعہ میں عمارت خاص وعام، غسل خانہ، محل سرائے اور عالمگیر کی بنائی ہوئی موتی مسجد قابل دید اور بے نظیر عمارتیں ہیں۔ اگر اس قلعہ کو ہندستانی عمارت، پچی کاری، نبت کاری، صنعت گری ودستکاری کا عجائب خانہ کہا جائے تو بہت ہی موزوں ہوگا۔ (ماخوذ از سفرنامہ ڈاکٹر برنیر۔ آثار الصنادید سرسید۔ ظفر نامہ

شاہجہاں وقصص ہندآزاد)۔

نوٹ نمبر4۔جامع مسجد(دہلی)اس کی بنیاد1060ھ(1650)24رج میں رکھی گئی تھی۔پانچ ہزار مزدور، بیلدار اور سنگ تراش روزانہ کام کرتے تھے۔تب بھی چھ برس میں دس لاکھ روپے کے صرف سے بن کر تیار ہوئی تھی۔اس کے تین گنبد ہیں۔نوے گز طول اور تیس گز کے عرض میں۔اندر کو سات محرابیں۔باہر صحن کی طرف گیارہ دروازے ہیں جن میں ایک تو بہت بلند ہے۔اور 5-5 اِدھر اُدھر والے ذرا نیچے ہیں۔بڑے دروازے پر کلمہ یا'ہادی'بطور طغرا اور باقی دروازوں پر شاہجہاں کے نام کا کتبہ، تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نور اللہ خوشنویس نے خط نسخ میں لکھا تھا۔سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے۔دروازوں کے دونوں طرف نہایت بلند اور خوشنما مینار ہیں جن میں اوپر جانے کے لیے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں بہت ہی دلکشا بنی ہوئی ہیں۔شمالی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا تھا اور فرش صحن بھی جو سنگ سرخ کا ہے خراب ہو گیا تھا۔1233ھ(1817) میں دولت برطانیہ نے دونوں کی تعمیر و مرمت کرادی۔چونکہ اس مسجد میں کوئی مکبر نہ تھا اس لیے شہزادہ مرزا سلیم بن معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ نے 1245ھ(1829) میں بڑے دروازے کے بیچ میں سنگ باسی کا بہت ہی خوشنما مکبر بنوادیا ہے۔مسجد کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے جس میں سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے مصلے بنائے گئے ہیں۔ممبر سنگ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے۔شمالی دالان میں کچھ تبرکات محمدؐ کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریفہ کہلاتا ہے۔صحن مسجد کا عرض و طول سے 138 گز ہے۔جس کے وسط میں 12x15 گز کا خالص سنگ مرمر کا حوض ہے اور اس میں فوارہ لگا ہوا ہے۔صحن کے گرد دالان، حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔جنوبی و مشرقی دالان کے سامنے دائرۂ ہندی وقتِ نماز دیکھنے کا بنا ہوا ہے۔تینوں دروازہ ہائے مسجد میں برجی پھاٹک چڑھے ہوئے ہیں۔جنوبی دروازے پر رہائش کے قابل حجرے بنے ہوئے ہیں۔چھتیس سیڑھیاں ہیں جن پر تیسرے پہر کو بازار لگتا اور مجمع عام ہوتا ہے۔اس مسجد کا مہتمم پانچ مہینے تک جعفر خان دو سال تک خلیل اللہ خاں، تین سال پانچ مہینے سعد اللہ خاں اور اس کے انتقال کے بعد روح اللہ داروغہ عمارت رہا۔اسی کے زمانہ میں بن کر تمام ہوئی تھی۔کسی نے تاریخ کہی ۔

مسجد شاہ جہاں قبلۂ حاجات آمد

اور گو ایک سال کا فرق ہے۔یعنی مسجد بنی ہے 1066-67ھ(31ج) میں اور اس تاریخ سے

1067ھ نکلتا ہے۔لیکن جدت ادا کی بنا پر بادشاہ نے بہت پسند کی (ماخوذ از آثار الصنادید و سیر المتاخرین)۔

نوٹ نمبر 5۔موتی مسجد (آگرہ)۔ قلعہ آگرہ میں دہلی دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد سب سے پہلی عمارت یہی ہے۔یہ مسجد بہت ہی خوب صورت ہے اور ایک مرتفع چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔اس کی مغربی و شمالی دیواریں 234 فٹ لمبی ہیں اور شمالی و جنوبی دیواریں 187 فٹ کی ہیں۔باہر تو سنگ سرخ ہے جو اپنی سادگی میں بھی لطف دیتا ہے لیکن اندر قبہ نور ہے۔نرا سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے اور کاریگری باعتبار تناسب ختم کردی گئی ہے۔اس کی اعلیٰ خوب صورتی (Classic Beauty) کو قلم کی مجال نہیں کہ تحریر میں لاسکے۔بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ سے جنت کا جگر پارہ اس فرش خاکی پر عقل انسانی کو حیرت میں ڈالنے کے لیے اتر آیا ہے۔صحن مسجد 155 فٹ مربع ہے۔بیچ میں پیارا چوکور حوض ہے اور جنوبی و مشرقی گوشہ میں ایک دھوپ گھڑی نہایت نفیس بنی ہوئی ہے۔صحن کے تین طرف خوشنما دالان دلفریبی پر حکومت کر رہے ہیں۔جن کی چوڑائی گیارہ فٹ ہے۔دالان مسجد 142 فٹ لمبا اور 56 فٹ چوڑا ہے۔اس کے اوپر تین سڈول اور پرنزاکت گنبد ہیں اور ہر گوشے میں ایک مینار ہے۔گنبدوں کے واسطے ہیول لکھتا ہے: 'بالکل کلیاں معلوم ہوتی ہیں جو کھلنے کو ہیں'۔مسجد کے دونوں طرف حجرے ہیں جو غالباً مستورات کے واسطے مخصوص ہوں گے۔کیونکہ ان میں پتھر کی سیک اور نفیس جالیاں لگی ہوئی ہیں۔یہ مسجد رنگ آمیزی سے بالکل معرا ہے۔البتہ صفوں میں زرد پتھر (کھٹوا) دیا گیا ہے۔مگر سادگی بھی وہ بلا کی ہے جس کے لیے بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

اس مسجد کو شاہجہاں نے بنوایا تھا۔1648 میں بنا شروع ہوئی اور 1655 میں اختتام کو پہنچی۔لاگت تین لاکھ (3,00000) روپے بیان کی جاتی ہے، جو اب تین لاکھ ہی مرتبہ اس مسجد پر سے نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے۔(ماخوذ از ارض تاج مصنفہ واحد یار خان بی۔اے) خان صاحب مولوی محمد اسمٰعیل خان مرحوم ہیڈ مولوی نارمل اسکول آگرہ نے اس کی سادگی اور موجودہ دردناک حالت کا فوٹو بہ عنوان مثمن قلعہ آگرہ کے جن پُر درد و پُر اشعار میں کھینچا ہے۔درج ذیل ہیں ؎

وہ مسجد زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن — خوبی میں یگانہ ہے، مگر سادہ و پُر فن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان، تو ہے دودھ سا آنگن

کافور کا تو دہ ہے کہ الماس کا معدن
یا نجر کا مطلع ہے کہ خودروز ہے روشن

بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے
سانچے میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے

یا تار نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے
مرمر میں مہ و مہر کا سا نور وضیا ہے

نہ شمع، نہ فانوس، نہ بتی، نہ دیا ہے
ہاں چشمہ خورشید سے آب اس نے پیا ہے

چلیے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارے کی دو مجھ کو اجازت ابھی کچھ اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی
'اس قلعہ میں ہیں شاہجہاں کی میں نشانی'

کچھ شوکت ماضی کی کہی اس نے کہانی
کچھ حالت موجودہ بایں شعر بیانی

اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی
فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی

تسبیح، نہ تہلیل، نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا
مجمع تھا کبھی یاں علما و صلحا کا

چرچا تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا
ہوتا تھا ادا خطبہ صدا حمد وثنا کا

اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عزّ وعُلا کا
جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا

ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے، یا چاندنی، یا سایۂ مسکین

نوٹ نمبر 6۔ حیات بخش۔ قلعۂ دہلی کا مشہور و معروف پُر فضا باغ ہے۔ یہ باغ اپنے احیاض و عمارات سمیت 1058ھ۔ 21رج میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اس کے حوض کے وسط میں ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (المتوفی 7/نومبر 1862) نے 1258ھ (1843)۔ 6رج میں سنگِ سرخ کا محل بنا کر اس کا تاریخی نام 'ظفر محل' رکھا تھا۔ جواب 'جل محل' کے نام سے مشہور ہے۔ اب یہ باغ مغربی طرز پر آراستہ پیراستہ ہے۔ اس کی سرسبزی وشادابی کا ہر بادشاہ نے بہت لحاظ رکھا۔ خصوصاً عالمگیر کو اس کی تازگی پر خاص توجہ تھی۔

(ماخوذ از آثار الصنادید۔ رقعات عالمگیری)۔

نوٹ نمبر 7۔ شالا مار۔ تین باغوں کا نام ہے جن میں سے ایک کشمیر میں وہاں کی مشہور جھیل (ڈل) اور اس کے ادھر والے پہاڑوں کے درمیانی پہاڑوں کے ڈھال پر واقع ہے۔ یہ باغ بہت ہی پُر فضا اور عجیب وغریب درختوں سے

پُر ہے۔ اس باغ کو جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہاں نے باپ کی فرمائش سے بنایا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس نام سے موسوم کیا تھا۔ گو شاہجہاں نے اپنے جلوس کے ساتویں سال اس کا نام بدل کر 'فرح بخش' رکھ دیا تھا لیکن اس نام نے رواج نہ پایا۔ صرف کتابوں اور کاغذات میں لکھا جاتا رہا۔ عام لوگ 'شالا مار' ہی کہتے رہے۔ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ دوسرا لاہور میں۔ یہ شاہجہاں کے عہد میں اسی کی فرمائش سے شالا مار کشمیر کی طرز پر تعمیر ہوا تھا اور باغ فیض بخش کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اب بھی لاہور میں موجود ہے۔ بہترین باغوں میں شمار ہوتا ہے۔ نام نے اس کے بھی رواج نہ پایا اور 'شالا مار' ہی کہلایا۔

تیسرا دہلی میں جو لاہوری دروازے سے باہر فصیل شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، بقول صاحب اثار الصنادید۔ شاہجہاں نے اس کی بنیاد تخمیناً سنہ میں جبکہ وہ شہر پناہ بنوا کر فارغ ہوا ہے رکھی تھی۔ اب غیر آباد ہے۔ چند درخت آم کے باقی ہیں۔ جن کا آم بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اس باغ کا نام اعز آباد رکھا گیا تھا لیکن مشہور نہ ہوا اور شالا مار ہی کے نام سے معروف ہے۔

لفظ شالا مار کے متعلق خلیفہ سید محمد حسین نے اپنے ترجمہ کردہ وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر کے حواشی میں لکھا ہے۔ 'ٹیک چند بہار نے اس کو سنسکرت کا لفظ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ 'شالا' اور 'مار' سے مرکب ہے جو بمعنی 'خانہ شہوی' کے ہے۔ اور مجازاً باغ کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے۔ اس کی سند میں مرزا عبدالغنی قبول کا یہ شعر لایا ہے۔

زباغ زلف و رخ یار داوہ است فراغم　　　　کہ سنبل سہیش کم ز شالا مار نباشد

لیکن ان معنوں کی غلطی خود ظاہر ہے کیونکہ شاعر نے لفظ کو باغ کے عام معنوں میں نہیں لیا ہے اور ظاہراً یہ ترکیب قواعد زبان سنسکرت کے بھی خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ لفظ ہندی ہوتا تو مار شالا ہونا چاہیے تھا۔ جیسے دھرم شالا۔ پاٹھ شالا۔ گئو شالا وغیرہ۔ اصل یہ ہے کہ یہ صرف اس جگہ کا نام تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہاں نے باپ کی فرمائش سے باغ بنایا تھا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس کا نام شالا مار پڑ گیا تھا جس کو شاہجہاں نے اپنے عہد کے ساتویں سال میں بدل کر فرح بخش نام رکھا۔ چنانچہ تزک جہانگیری اور شاہجہاں نامہ وغیرہ کتب تاریخ میں صاف اور صریح لکھا ہے اور دیوان کرپا رام صاحب نے جو اپنی کتاب موسوم بہ گلزار کشمیر کے صفحہ 210 پر شاہجہاں کا ایک فرمان نقل کیا ہے، اس کے ایک فقرے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ فقرہ یہ ہے 'دباغ فرح بخش کہ واقع است در موضع مصروف شالما مابدولت و اقبال درایام

فرخندہ فرجام شاہزادگی احداث فرمودہ بودیم'۔

میری رائے میں خلیفہ محمد حسین صاحب کا قیاس بہت ہی مدلل اور صحت سے بہت زیادہ قریب ہے لیکن ٹیک چند بہار کی تحقیق کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا کیونکہ صاحب اثار الصنادید نے جو جہانگیر جیسے محقق بادشاہ کا قول توزک جہانگیری اور مرأت آفتاب نما کے حوالے سے نقل کیا ہے اس سے بھی بہار کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے 'شالا مار دو ہندی لفظوں شالا (بمعنی کھڑکی) اور مار (بمعنی عیش یا خوشی) سے مرکب ہے۔ جس کے معنی 'دریچہ فرح' ہیں۔

میں نے خود اس زمانے کی ترتیب یافتہ زبان سنسکرت کی مستند لغت موسومہ سنسکرت انگلش اسٹنڈرڈ ڈکشنری سے تحقیق کیا۔ اس میں مار کے معانی مارنا، مخالفت، محبت خدا، عیش، خواہش نفسانی اور شیطانی وغیرہ کے ہیں اور شالا کے معانی مکان، کوٹھری اور شاخ درخت کے۔ اس حیثیت سے بھی بہار کی تحقیق محقق اور اس کی رائے صائب ہے۔ لیکن جہانگیر کی تحقیق مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ نہ لغت مذکور میں شالا کے معنی دریچہ کے نکلے اور نہ مجھے دیگر ذرائع سے تحقیق ہو سکے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ کل بول کر جز مراد لیا گیا ہے تو اس کی رائے بھی صحیح ہوئی جاتی ہے اور غالباً ایسا ہی ہوگا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ شالا مار کشمیر کا نام محل وقوع کی حیثیت سے شالا مار رکھتے وقت اس میں یہ معنوی خوبی بھی مدنظر رکھی گئی ہو جس کا اور باغوں کے تسمیہ میں خصوصیت کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

نوٹ نمبر 8۔ اردو صاحب 'شعرالہند' کی رائے ہے کہ اردو زبان اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں جنم لے چکی تھی اور قطب شاہی دور میں دکن میں بہت کچھ ترقی پا چکی تھی۔ زبان کی حیثیت سے اس کو اورنگ زیب کے عہد میں اس کی فتوحات دکن کے زمانہ سے ماننا چاہیے۔ اس کے بعد کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں پایا جاتا ہے کہ فارسی شعرا ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے تھے اور اس کو انھوں نے اردو کی ابتدا مانی ہے۔ لیکن صاحب آب حیات و صاحب آثار الصنادید شاہجہاں کے عہد میں اس کا وجود میں آنا بیان کرتے ہیں اور یہی متفقہ جمہور ہے۔

اخبار 'العدل' بدایون کی اشاعت 19/ مارچ 1926 کے بیان کے مطابق ہندوستان کے ان باشندوں کی تعداد جن کی مادری زبان اردو یا ہندستانی ہے، دس کروڑ کے قریب ہے۔ اگر اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لیے جائیں جن کی زبان رپورٹ مردم شماری میں راجستانی یا مارواڑی دکھائی گئی ہے اور ماہرین لسان اقرار

کرتے ہیں کہ یہ بھی محض مغربی ہندی یا اردو کی ایک شاخ ہے تو اردو کے کل اہل زبان گیارہ کروڑ ہوتے ہیں۔ اور زبان اردو دنیا کی سب سے بڑی سات زبانوں میں شمار ہوسکتی ہے۔ بولنے والوں کی کثرت اور علاقوں کی وسعت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبانیں حسب ذیل ہیں۔

چینی، انگریزی، جرمنی، روسی، عربی، تاتاری اور اردو۔

ولادت

اس خوش نصیب، اقبال مند اور ہر دلعزیز بادشاہ کا مہر وجود مان متی [1] جودھا بائی دختر راجہ اُودے سنگھ [2] راٹھور والی جودھپور کے برج حمل سے 1000ھ (1591)=36 جلوس اکبر شاہی میں بمقام لاہور طلوع ہوا۔

اس زمانہ کے منجمین نے اسے 'صاحب قران [3]' مانا ہے۔ اور چونکہ اس خاندان کا مورث اعلیٰ تیمور [4] لنگ بھی 'صاحب قران' تھا اس لیے اس کو 'صاحب قران ثانی' کہا جاتا ہے۔ اس کا عالم شاہزادگی کا نام 'خورم' تھا اور جہانگیر اس کو پیار میں 'بابا' کہا کرتا تھا [5]۔

نوٹ نمبر 1۔ مان متی جودھا بائی۔ یہ رانی 'جگت گسائیں' کے نام سے مشہور ہے۔ راجہ 'مالدیو' کی پوتی اور 'راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف راجہ موٹہ فرمانروائے جودھپور کی بیٹی تھی۔ 19/رجب 993ھ کو شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے ساتھ بیاہی گئی۔ نہایت حسین، دانشمند، نیک طینت، باسلیقہ، خوش بیان، شیریں کلام اور حاضر جواب رانی تھی۔ اس کی حاضر جوابی کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ نور جہاں بیگم میں اور اس میں اکثر رقیبانہ نوک جھونک رہا کرتی تھی۔

لطیفہ۔ فتح پور سیکری جیسا دلکش مقام تھا اور ہر طرف سکوت طاری۔ چاندنی رات تھی اور زمین سے آسمان تک عالم نور، ہر چیز پر بیخودی چھائی ہوئی تھی۔ مے و مینا کا دلدادہ جہانگیر شغل مے نوشی میں مصروف تھا۔ اس کی محبوبہ نور جہاں اپنے عادت کے موافق سفید لباس زیب تن کیے پہلو میں بیٹھی ہوئی زہد شکن اور متوالی اداؤں سے اس کا دل لبھا رہی تھی۔ یکا یک اس منظر پر کیف سے سرشار بادشاہ کو جودھا بائی یاد آئی اور اس کے شریک صحبت ہونے کا حکم ہوا۔ پرستاریں دوڑیں اور یہ آن کے آن میں سرخ لباس میں ملبوس بادشاہ کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ بادشاہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ نور جہاں کو رشک ہوا۔ بادشاہ سے کہنے لگی۔ 'دیکھیے! جودھا بائی آخر ہے نا ایک زمیندار کی بیٹی اور ہندستانی گنوریا؟ کوئی پوچھے اس وقت سرخ جوڑا پہننے کی کیا تک تھی؟ جہانگیر نے جودھا بائی کی

طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی کہ کیا جواب ہے؟ جودھابائی نے عرض کیا: 'حضور! ان کا سہاگ تو شیر افگن خان کے مرنے سے اجڑ گیا۔ اللہ رکھے میرا سہاگ بھاگ قائم ہے اور یہ دوہا پڑھا۔

جار نار تاس کا بتیا ایک چھوڑ جن دو جا کیا

نور جہاں بے حد خفیف ہوئی اپنا سامنہ لے کر رہ گئی اور اس قدر جھینپی کہ اٹھ کر چل دی۔ جہانگیر ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گیا۔

قلعہ آگرہ و فتح پور سیکری میں جودھابائی کے عالی شان محلات اب تک اس کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اس نے آگرہ میں 'سہاگ پورہ کے نام سے ایک محلہ آباد کر کے اس میں اپنے عالی شان محلات و باغات تعمیر کرائے تھے۔ اب یہ محلہ ویران ہو چکا ہے۔ صرف اس کے عالی شان مقبرے کے جو اسی محلہ میں واقع تھا مٹے مٹے سے نشانات باقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقام اب تک جودھابائی کے نام سے مشہور اور موضع بھوگی پورہ پرگنہ صدر تحصیل آگرہ میں شہر کے متصل واقع ہے۔ اس لائق و فائق رانی نے بروز جمعہ 30 ربیع الثانی 1028ھ کو رحلت کی۔ جہانگیر کو بہت رنج ہوا۔ دوسرے دن غم زدہ بیٹے (خورم) کے مکان پر خود گیا اور اسے تسلی تشفی کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ (ماخوذ از امرائے ہنود۔ دربار اکبری، تاریخ ہند مصنفہ ای مارسڈن، ماثر الامرا بادشاہ نامہ وغیرہ)۔

نوٹ نمبر 2۔ راجہ اُودے سنگھ راٹھور۔ موٹہ راجہ عرف سن پیدائش لامعلوم رائے مالدیو فرمانروائے جودھ پور کا بڑا بیٹا تھا۔ رائے مالدیو امارت و جمعیت لشکر کی حیثیت سے تمام راجگان ہند میں ممتاز و ممتاز راجہ تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا 'چندر سین' اس کا جانشین ہوا جس نے 15ج اکبر شاہی میں اکبر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ لیکن 19ج میں باغی ہو گیا۔ شاہی فوجیں اس کی گوشمالی کے لیے متعین ہوئیں۔ کئی معرکوں کے بعد 25ج میں پایندہ خان مغل سے شکست فاش کھا کر بھاگا اور روپوش ہو گیا۔ اس کی فراری کے بعد راجہ اودے سنگھ مسند نشین حکومت جودھ پور ہوا اور اس قدر اکبر کے اخلاق و محبت کا گرویدہ ہوا کہ خاندانی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر اس نے اپنی چہیتی بیٹی (جودھابائی) ولی عہد سلطنت شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کو بیاہ دی۔ اکبر خود امرا و بیگمات کے ہمراہ راجہ کے مکان پر بیٹے کے بیاہنے کو گیا اور بڑی دھوم دھام سے دلہن کو بیاہ لایا۔ اس رشتے کے بعد راجہ اودے سنگھ منصب ہزاری پر سرفراز ہوا اور وطن کی حکومت اس کو بطور جاگیر مرحمت ہوئی۔ 40ج میں وہ رہ گرائے عالم باقی ہوا۔ (ماخوذ از امرائے ہنود۔ دربار اکبری)۔

نوٹ نمبر 3۔ صاحب قران۔ مرکب ہے۔ صاحب (والا) اور قران سے قران بالکسر قاف اصطلاح نجومیاں میں سبعہ سیارگان میں سے باستثنائے آفتاب دو سیاروں کے ایک درجے یا ایک دقیقے پر یکجا ہونے کو کہتے ہیں۔ وہ بچہ جس کے استقرار حمل یا ولادت کے وقت قران عظمٰی ہو اور برج قران طالع میں ہو' صاحب قران کہلاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس بچے کے سال ولادت میں زحل و مشتری کا قران عظمٰی ہو وہ 'صاحب قران' کہلاتے ہے۔ ایسا قران برسوں بعد ہوتا ہے۔ اسکندری سے منقول ہے کہ جس بچہ کی پیدائش کے وقت زہرہ مشتری کو قران ہو'صاحب قران کہلائے گا۔ جو بچہ صاحب قران ہوتا ہے وہ صاحب اقبال، صاحب حکومت، صاحب سلطنت ہوتا ہےاور اس کی حکومت وسلطنت بدیر قائم رہتی ہے۔ (غیاث اللغات بحوالہ کشف وموئید)۔

نوٹ نمبر 4۔ تیمور لنگ۔ یہ 'تمر' یا 'تمیر' بھی کہلاتا تھا۔ ('تمر' ترکی زبان میں لوہے کو کہتے ہیں) اور عام طور پر تیمور لنگ گورکان، صاحقران مشہور ہے۔ کتاب عجائب المقدور فی احوال تیمور میں جو اس کی سخت ہجو آمیز تاریخ ہے۔ اس کے القاب وخطاب کی وجہ یہ لکھی ہے: 'ابتدائے حال میں کسی شخص کی بکری چراتے ہوئے اس کے تیر کے زخم سے اس کی ایک ٹانگ لنگڑی ہوگئی تھی۔ اس لیے 'لنگ' اور چونکہ اس نے اکثر ترکوں کے خاندانوں میں اپنی شادیاں کر لی تھیں اس لیے اس کے ہم قوم اس کو 'گورکان' کہتے تھے۔ 'گورکان ترکی میں 'داماد' کو کہتے ہیں۔' صاحقران' کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بادشاہ ہونے پر اس کا زائچہ طالع بنا کر بعض خوشامدیوں نے لکھ دیا تھا کہ زہرہ و مشتری جو نجومیوں کے عقیدے میں دو بڑے سعد ستارے ہیں، قرن کی حالت میں طالع میں پڑے ہیں۔

تیمور کے باپ کا نام طراغائی تھا، جو مغل خان ترک کی نسل سے تھا۔ بعض مورخین کسی گڈریے کا لڑکا لکھتے ہیں۔ مگر یہ قول کچھ زیادہ مستند نہیں۔

تیمور 9۔ اپریل 1336 ۔736ھ کو بمقام کش (المعروف بہ شہر سبز متصل سمرقند جواب روسیوں کی علمداری میں ہے) جو قدیم سُگدانیا میں واقع ہے پیدا ہوا۔

ظفر نامہ میں جو اس کی ایک خوشامد آمیز تاریخ ہے، اس کے عروج کا حال یوں لکھا ہے:

'امیر حسن بن امیر مُسلا بن امیر قزغن (جس کے دادا امیر قزغن نے 747ھ میں قران سلطان بن یسور اغلن نامی جابر وخونی بادشاہ ترکستان وماوراء النہر پر فتح پا کر اور اسے قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کیا تھا) ترکستان وماوراء النہر کا ایک ذی اقتدار فرمان رواں تھا۔ اس کی بہن کی شادی تیمور کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ابتداءً

دونوں میں بڑا اتحاد تھا۔ آخر کار رشک وحسد کے مارے دونوں میں بگاڑ ہو گیا۔ ادھر امیر حسن کی بہن مرگئی اور تعلق منقطع ہو گیا۔ اور امیر تیمور نے کشتی سے قلعۂ ہندوان (متصل بلخ) پر جو امیر حسین کا دارالسلطنت تھا، فوج کشی کر کے اسے فتح کر لیا۔ امیر حسین گرفتار ہو کر مع اپنے دو بیٹوں کے قتل ہوا۔ باقی دو بیٹے ہندوستان کی طرف بھاگ گئے۔ اس کی زوجہ سرائے ملک خانم بنت قران سلطان اور چند دوسری بیگمات جو معزز قبائل کی لڑکیاں سمجھی گئیں تیمور کی حرم میں داخل کر لی گئیں۔ بقیہ بیگمیں امرائے تیموری پر تقسیم ہو گئیں۔ قلعۂ ہندوان مع عمارات کے کھدوا کر پھینک دیا گیا اور امیر حسین کا نام ونشان اس طرح مٹا کر 12/رمضان 771ھ۔10/اپریل 1369 کو وہ تخت نشیں ہوا' یہی ابتدائے سلطنت ہے۔

تھوڑے ہی زمانہ میں اس کی بری طاقت حد کو پہنچ گئی۔ اور گو بحری طاقت اس کے پاس نہ تھی لیکن اس کی عاقبت اندیشی، استقلال اور مدبرانہ سپاہی پن نے اسے فاتح اعظم بنا دیا۔ ایشیا و یورپ کے مورخین ہم زبان ہیں کہ فاتح ہونے کی حیثیت سے تیمور لا ثانی تھا۔ خسرو اعظم، سکندر اعظم، قیصر، چنگیز خان اور نپولین ان میں سے کسی کو یہ بات میسر نہیں آئی۔ سلطنت چین کی بڑی دیوار سے وسط روس اور بحر روم و دریائے نیل سے دریائے گنگ تک اس کے فتوحات تھے۔ ایشیا میں صرف چین فتح کرنا باقی تھا۔ اس کی فتح کو چلا تھا کہ ملک الموت کی فوج نے خرمن حیات پر چھاپہ مارا۔ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

تیمور کا قول تھا کہ جس طرح آسمان پر ایک خدا ہے اسی طرح دنیا پر ایک حکمران ہونا چاہیے۔ اگر وقت مساعدت کرتا اور حیات مستعار ساتھ دیتی تو اس قول کو عمل کا لباس پہنائے بغیر نہ رہتا۔

مرنے کے وقت 807ھ 1405 میں اس کی عمر 71 سال تھی جس میں سے 36 برس اس نے حکومت کی۔

تاریخ اسلام میں مولوی احسان اللہ صاحب عباسی نے لکھا ہے: تیمور صرف بلاد اسلام ہی کا بادشاہ نہ تھا بلکہ تمام یورپ، ایشیا اور افریقہ پر اس کا اثر تھا۔ اسی وجہ سے اس کو مؤرخین نے 'صاحبقران' کہا ہے۔ اور سکندر اعظم کے بعد اس لقب کا مستحق اسی کو سمجھا ہے۔ وہ چنگیز مثال تھا اور اس کا مسلمان ہونا اس پر المضاعف'۔

وہ جن ملکوں کو فتح کیا کرتا تھا ان پر سلطنت کرنے کا خیال نہ کرتا تھا۔ چنانچہ 801ھ (1398) میں اس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور 17/دسمبر 1398 کو منگل کے دن دہلی میں داخل ہوا اور لوٹ مار کر کے چل دیا اصل

میں وہ اپنی سلطنت ایران و ماوراءالنہر کو سمجھا کرتا تھا اور اسی کی خوشحالی و آبادی میں کوشاں رہتا تھا قاموس المشاہیر میں لکھا ہے:

جس سال وہ مرا ہے اسی سال میں اس نے اپنے لڑکوں کی شادی میں اتنا بڑا جشن ترتیب دیا تھا کہ چکا گو کی نمائش اس کے سامنے بے حقیقت تھی۔ دنیا کے ہر گوشہ کا آدمی شریک ہوا تھا، سفرائے یورپ بھی آئے تھے۔ اس زمانے میں یورپ بہت ہی پست حالت میں تھا۔ چنانچہ اس عہد بعید کے مؤرخین نے انھیں چھوٹی مچھلیوں وغیرہ سے تشبیہ دے کر ایک مضحکہ خیز پیرائے میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ قصہ مختصر، تیمور ایک جفاکش، بیدار مغز، مردم شناس اور اولوالعزم شہنشاہ تھا۔ اس کی زندگی کا حرف حرف کچھ کرنے والے انسان کے لیے سبق عبرت ہے۔ وہ فن مصوری کا مبصر و قدر دان تھا۔ علما، فضلا اور اہل کمال کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا تھا۔

لطیفہ۔ امیر تیمور صاحب قران نے شاہ منصور بن مظفر شاہ کے عہد میں شیراز پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اسی زمانہ میں حافظ شیرازیؒ (المتوفی 793ھ) نے ایک تازہ غزل کہی تھی۔ جس کا ایک شعر تھا۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا   بخال ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را

تیمور نے یہ شعر سنا تو خواجہ صاحب کو طلب کر کے کہا: 'میں نے تمام عالم کو اس لیے ویران کیا کہ سمرقند و بخارا کو کہ میرا وطن ہے آباد کروں، تم ان کو ایک تل کے عوض دیے ڈالتے ہو'۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا: 'ان ہی فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقے تک نوبت پہنچی ہے۔' (شعر العجم علامہ شبلی مرحوم)

لطیفہ۔ تیمور نے ایک گویئے کو بلوایا جو اندھا تھا۔ پوچھا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: 'دولت'۔ امیر نے کہا: 'دولت کو اندھا نہ ہونا چاہیے۔' اس نے جواب دیا: 'اگر اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے گھر کیوں آتی۔' (لطائف)

اصل لطیفے میں لطف زیادہ ہے کیونکہ فارسی میں صفت و فعل کی تذکیر و تانیث نہیں ہوتی۔ اس لیے گویا جواب ذومعنی ہوا۔

نوٹ نمبر 5۔ دربار اکبری۔

تربیت

اس کے دادا اکبر اعظم نے بہ نفس نفیس خود جہانگیر کے محل میں جا کر اور ہونہار پوتے کی لوحِ جبین سے ستارۂ بلندی کے آثار ہویدا پا کر اسے اپنی فرزندی میں لے لیا اور اس کی پرورش و ترتیب اپنی پہلی بیگم خدیجہ الزمانی[1] رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال[2] مرزا کے سپرد کر کے فرمایا: 'لو

تمھیں لاولدی کا بہت صدمہ رہتا ہے۔ اسے میرا اور اپنا بیٹا سمجھ کر پرورش کرو۔ دادی نے اسے آنکھوں میں جگہ دی۔ کلیجہ سے لگایا اور یہ مردم چشم کی طرح ہر وقت اس کے پیش نگاہ رہا۔

نوٹ نمبر 1۔ خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم۔ رقیہ سلطان بیگم نام۔ خدیجۃ الزمانی خطاب، ہندال مرزا ابن بابر کی بیٹی ہمایون کی بھتیجی اور اکبر کی زنِ کلاں (پہلی بی بی) تھی۔ اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے خورم کو اس بیگم کے حوالے کیا گیا تھا۔ اسی نے اس شاہزادے کو پالا پوسا اور تربیت کیا۔ شیر افگن خان کے مرنے کے بعد نور جہاں اسی بیگم کے پاس رہی تھی۔ اسے اپنی اس بہو کے ساتھ بہت زیادہ محبت تھی۔ آگرہ میں 84 برس کی عمر میں 7 رجمادی الاوّل 1025ھ (1626) میں داعی اجل کو 'لبیک' کہا۔ (اقبالنامہ اکبری۔ قاموس المشاہیر)۔

نوٹ نمبر 2۔ ہندال مرزا۔ بن بابر بادشاہ برادر ہمایوں 924ھ (1518) میں پیدا ہوا۔ 'کوکب برج شہنشاہی' تاریخ ہوئی۔ ہمایوں نے باپ کے مرنے پر اسے مرکار الور دے دی تھی۔ مثل اور بھائیوں کے ہمایوں اور ہندال کے مابین بھی کبھی کبھی لڑائی ہوئی۔ آخر کار یہ ہمایوں کا فرماں بردار ہو گیا تھا۔ ایک رات کامران مرزا (برادر ہمایوں) نے جب ہمایوں پر جوے شاہی کے قریب (حدود کابل میں) شب خون کیا اس زمانہ میں ہمایوں نے ہندال کو غزنی سے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ شب خون کی خبر سن کر ہندال مرزا جو رات بھر موروچوں کا انتظام کر کے اور تھک کر سویا تھا، چونک پڑا۔ رات اندھیری تھی اس کے ملازم گھوڑوں کے اہتمام کے لیے دوڑے اور یہ خود افغانوں کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ تیر وکمان سے نوبت گزری۔ مرزا نے ایک افغان کو پکڑ کر پھینک دیا۔ مقتول کے بھائی جرندہ افغان نے کہ قبیلہ مہمند سے تھا۔ ایک پیکان زہر آلود مرزا کو مار کر شہید کیا۔ اس کی شہادت 21ر ذی قعدہ 958ھ۔ 9 رنومبر 1551 عین جوانی میں ہوئی۔ کسی نے 'شب خون' سے تاریخ شہادت نکالی۔ ہمایوں کو تو اس کے مرنے کا صدمہ ہوا ہی اور مدتوں رہا، لیکن کامران کو بھی کم رنج نہ ہوا۔ جب اس کا ترکش قاتل افغان لے کر کامران کے پاس پہنچا تو اس نے پہچان کر دستار زمین پر دے پٹکی تھی۔ کچھ دنوں مرزا ہندال کا تابوت جوے شاہی میں امانتاً رکھا رہا اور بعد میں کابل لا کر باپ کے پہلو میں سپرد زمین کیا گیا۔ یہ لڑائی ہمایوں کی واپسی ایران کے بعد ہوئی تھی۔ اکبر ہوشیار تھا۔ لڑائی کے دن باپ کے پہلو بہ پہلو ایک ٹیلہ پر کھڑا تماشائے جنگ دیکھ رہا تھا۔ ہمایوں نے دوسرے روز بہسود پہنچ کر مرزا مرحوم کی جاگیر اور اس کا کل خدم وحشم اکبر کے سپرد کر دیا اور اس کی بیٹی رقیہ سلطان بیگم (جس کا نام مرتب اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری نے رضیہ بھی لکھا ہے اور جو غلط ہے) اس کے ساتھ

منسوب کر دی۔ اکبر نے ہمیشہ اس کے اعزاز کو مدنظر رکھا۔ (اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری، قاموس المشاہیر اور جلد سوم تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ)۔

دادا سے محبت

اس وقت سے اکبر کے دم آخر تک یہ اقبال مند دادا کے قدموں سے لگا رہا۔ حتیٰ کہ جب جہانگیر نے برسر بغاوت ہو کر اکبر کے مقابلہ میں آ کر 11-1009ھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ باپ بیٹوں میں بدمزگی پیدا ہوئی تا اینکہ اکبر پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔ خسرو[1] (بن جہانگیر) کے بہی خواہ (خان[2] اعظم اور راجہ[3] مان سنگھ) کے مسلح آدمی اس کی خواب گاہ کو مخفی طور پر گھیرے ہوئے سازشیں کر رہے ہیں۔ جہانگیر خفیہ طور پر شاہزادے کو بلا بھیجتا ہے بلکہ اس دوسرے موقع پر تو ماں بے قرار ہو کر اس کو لینے کے لیے خود دوڑی ہوئی جاتی ہے، لیکن پھر بھی یہ محبت کا پتلا اور سعادت مندی کا مجسمہ ایسے نازک وقت میں بستر آخر سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتا اور رحلت کے بعد ہی باپ کا شریک حال ہوتا ہے[4]۔

اس کا ان اوقات میں دادا کے پاس رہنا ہی بہتر ہوا کیونکہ زمانہ بغاوت و سرکشی جہانگیر میں اس کی خداداد سنجیدگی و فطری نیک طبعی باوجود صغر سن ہمیشہ باپ اور دادا میں صفائی کا ایک ذریعہ ہوتی رہی۔ اسی طرح اکبر کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے وقت باپ کو دم دم کی خبریں پہنچا کر اس کی ذات کو نرغۂ اعدا سے اور سلطنت کو خود غرض و نااہل باغیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کا فی الحقیقت وہی باعث ہوا[5]۔

نوٹ نمبر 1، 2 و 3 کے لیے دیکھو دربار اکبری حالات بھی جہانگیر اور بقیہ حواشی کو اس طرح سمجھنا چاہیے۔

خسرو۔ جہانگیر کا خلف اکبر تھا جو رمضان 995ھ (1587) میں بنت بھگوان داس والی جے پور (ہمشیر راجہ مرزا مان سنگھ) کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی ماں کو جہانگیر نے اس کی ولادت کے بعد 'شاہ بیگم' کا خطاب دیا تھا جو آج تک بطور اسم مشہور ہے۔ اس کا بیٹا جہانگیر کی وفات کے بعد عارضی بادشاہ ہندوستان ہوا۔ (دیکھو حاشیہ 1 صفحہ 103، حاشیہ 1 صفحہ 110)

خان اعظم۔ مرزا عزیز نام، مرزا کوکہ، کوکلتاش اور خان اعظم خطابات ہیں۔ اکبر کا رضاعی بھائی اور اس کے

ارکانِ سلطنت میں رکن رکین تھا۔ اکبر نے اس کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی ایک بیٹی اپنے بیٹے مراد کو اور ایک (اپنے ولی عہد کے خلف اعظم) خسرو کو بیاہ دی تھی۔ مدۃ العمر وہ اس کی ناز برداری کرتا رہا اور یہ بڑے بڑے صوبوں کا گورنر اور دربار کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہا۔ بعہد جہانگیر 1033ھ میں جبکہ داور بخش کا اتالیق ہو کر گجرات گیا ہے وہیں وفات پائی۔ دلی میں مدفون ہوا۔ بہت ہی بہادر، شجاع، صاحب حوصلہ، میر چشم، اعلیٰ درجہ کا شاعر نستعلیق نویس اور لطیفہ گو مگر ہٹ دھرم اور ضدی امیر تھا۔

مان سنگھ۔ (راجہ اور مرزا خطابات) راجہ بھگوان داس والیٔ جے پور کا بیٹا اور دربار اکبری کے عظیم الشان سپہ سالاروں اور ارکانِ سلطنت میں سے تھا۔ اس کی پھوپی الخاطب بہ 'مریم زمانی' والدہ جہانگیر اور اس کی بہن 'شاہ بیگم' زوجہ جہانگیر تھی۔ جہانگیر کے عہد سلطنت میں جبکہ مہم دکن پر متعین تھا، 1023ھ میں سورگ واسی ہوا۔ پندرہ سورانیوں میں سے ساٹھ نے ستی ہو کر حق رفاقت ادا کیا۔ بھاؤ سنگھ کو اپنی یادگار چھوڑا جو نذر شراب ہوا۔ مان سنگھ دلاور، خوش اخلاق، ملنسار، قدر دانِ علم و فن، خوش باش، پابند وضع و مذہب اور بہت ہی حاضر جواب راجہ تھا۔

مختصر طور پر ان واقعات کو یوں سمجھنا چاہیے کہ جس زمانہ میں جہانگیر اکبر سے باغی ہوا ہے، کہیں اکبر کے منہ سے غصہ میں نکل گیا تھا: 'اس باپ (جہانگیر) سے تو یہ بیٹا (خسرو) ہونہار اور قابل سلطنت معلوم ہوتا ہے'۔ یہ فقرہ گویا صورِ خود فراموشی تھا کہ جس نے خسرو کو بے خود کر دیا اور اس کے سر میں سودائے سلطنت سما گیا۔ وہ اکثر دادا کو باپ کے خلاف بھرتا اور باپ کے ساتھ گستاخیاں کرتا تھا۔ ماں نے بہت سمجھایا مگر یہ نہ مانا۔ آخر کار تنگ آ کر اور غیرت راجپوتی سے کام لے کر اس بے چاری نے خودکشی کر لی۔ اس نے وقت پر کام آنے کے لیے بہت سے آدمیوں کو تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے سالانہ دینا شروع کر دیا تھا۔ جب اکبر مرض الموت میں مبتلا ہوا تو مان سنگھ اور خان اعظم نے بعض راز داروں کے ذریعہ سے خسرو کی ولی عہدی اور جانشینی کی رسم کی ادائیگی کے متعلق جاں بلب بادشاہ کا مافی الضمیر دریافت کیا۔ دور اندیش بادشاہ نے سلطنت کو آل تیمور کے ہاتھوں سے نکلتے اور راجپوتوں کے قبضہ میں پہنچتے ہوئے دیکھ کر مان سنگھ کو فوراً بنگالہ جانے کا حکم دیا۔ جس کی فی الفور تعمیل ہوئی۔ جہانگیر کو بلا گلے لگا امرا و متعلقین کے متعلق وصیت کی اور ملبوس شاہی پہنا کر مصلحتاً شیخ فرید بخشی کے یہاں بھیج دیا۔ بعد وفات اکبر جہانگیر کی تاج پوشی

ہوئی۔ کچھ دن بعد خسرو رات کو مع اپنے خیر خواہوں کے بھاگا۔ لاہور میں اس سے اور شاہی فوج سے مقابلہ ہوا۔ اس کے بہت سے ساتھی قتل و غارت ہوئے۔ یہ گرفتار ہو کر مقید ہوا۔ بعض بیگمات اور جدروپ گسائیں کی سفارش سے بحالت قید دربار میں آنے کی اجازت مل گئی تھی مگر خان اعظم کی بدعنوانیوں اور اس کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر بادشاہ نے اسے آصف خان کی قید میں دے دیا۔ شاہجہاں سفارش کر کے اس کو اپنے ہمراہ دکن لے گیا جہاں اس کے درد قولنج اٹھا اور وہ قید مجازی و حقیقی دونوں سے چھوٹ گیا۔ بعض مؤرخین اس کی موت سیاسیات سے خالی نہیں بتاتے۔ وفات کے وقت اس کی عمر 36 سال تھی۔ نعش دہلی سے الہ آباد لا کر خسرو باغ الہ آباد میں ماں کے پہلو بہ پہلو دفن کی گئی۔

اس پر آشوب زمانہ میں مان سنگھ کا دستور العمل قابل داد تھا کہ بادشاہ کو شکایت و گرفت کا موقع نہ دیا۔ گو یقینی طور پر بھانجہ کا ساتھ دیتا ہوگا اور خان اعظم تو اس طرفداری کے سلسلہ میں مقید بھی ہوا، معتوب بھی رہا۔ تاہم اس کی یہ تمنا کہ کوئی ایک کان میں کہے خسرو بادشاہ ہو گیا اور دوسرے کان میں ملک الموت پیام موت دے، پوری نہ ہوئی۔ بلکہ بیٹی کے رنڈاپے کا داغ دیکھ کے مرا۔ (ماخوذ از دربار اکبری) 5،4 (دربار اکبری) 12۔

تعلیم و شخصیت

اکبر کا دربار مختلف ممالک و مذاہب کے وحید العصر و فقید المثال ماہرین علم و فن کا مرکز و ماویٰ تھا۔ شفیق دادا نے اپنے پیارے پوتے کی تعلیم و تربیت میں جس کے لیے بقول جہانگیر وہ جہانگیر سے اکثر کہا کرتا تھا ''او را بہ فرزندان دیگر تو ہیچگونہ نسبتے نیست واین را فرزند حقیقی خود میدانم'' کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی اور خدا ہی جانتا ہے کہ کس کس کے فیضان صحبت نے شاہجہاں کے جوہر قابل کو ترقی دینے میں کیا کچھ کیا ہوگا۔

اس کی دانائی، مستعدی، لیاقت اور حسن کارگزاری نے عالم شاہزادگی ہی میں جہانگیر کی پیشگاہ سے خطاب 'شاہی' اور تخت کے قریب مسند پر جلوس کرنے کا تمغۂ امتیاز حاصل کر لیا۔ جو بعد فتح دکن اس کے نصیب میں آیا۔ یہ وہ فخر تھا جو اس سے پہلے کسی شہزادے کو اس خاندان میں میسر نہیں ہوا۔ جہانگیر[1] نامہ میں بادشاہ کی یہ عبارت اسی اعزاز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

عنا یتے است نمایاں ولطفے است بے پایاں کہ نسبت بآن فرزندِ سعادت
مندظہور یافت۔ چہ از زمان حضرتِ صاحبقران تا حال ہیچ بادشاہے ازیں
سلسلۂ عالیہ ایں گونہ عنایتِ سرشار بفرزند شائستۂ خود نہ نمودہ۔

نوٹ۔1۔ جہانگیر نامہ۔ جہانگیر نے اپنے دوازدہ سالہ احوال خود لکھ کر اس نام سے موسوم کر کے اس کا پہلا نسخہ شاہجہاں کو دیا تھا۔ گویا یہ اس کی 'توزک' کا پہلا حصہ ہے۔ (ظفر نامہ)۔12۔

جہانگیر کا خاندان اور اُس کے تعلقات

جہانگیر کے کئی بیٹے تھے جن میں سے اس کی دم رحلت خورم و شہر یار[1] زندہ موجود تھے۔ نور جہاں[2] کے بھائی آصف[3] خان کی بیٹی (ممتاز محل) خورم کو اور خود نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن خان کے صلب سے تھی شہر یار کو بیاہی ہوئی تھی۔

نوٹ نمبر 1۔ شہر یار۔ سلطان شہر یار پورا نام جہانگیر (بن اکبر اعظم) کا بیٹا تھا۔ نور جہاں نے جہانگیر کے عقد میں آ کر اپنی بیٹی جو شیر افگن خان کے صلب سے تھی، اس سے منسوب کر دی تھی۔ صاحب سیر المتاخرین اس کو برادرزادہ جہانگیر اور پسر دانیال (المتوفی 1013ھ) بن اکبر اعظم لکھتے ہیں۔ چنانچہ سیر المتاخرین مطبوعہ نول کشور پریس ص:248 میں لکھا ہے۔ "بعد از آنکہ صبیۂ نور جہاں بیگم کہ از صلب شیر افگن خان بود، در حبالۂ ازدواج سلطان شہر یار برادرزادہ جہانگیر پسر شاہزادہ دانیال در آمد، نور جہاں بیگم کہ جمیع مہام سلطنت بہ قبضۂ اختیار و بود۔ جانب داری داماد خود سلطان شہر یار پیش نہادِ خاطر ساخت" حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ جمہور مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ شہر یار جہانگیر کا بیٹا تھا۔ اولاد کی تحقیق ماں باپ سے بڑھ کر اور کسے ہو سکتی ہے۔ خود جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے: "بعد از آنکہ بعضے فرزندان تولد یافتہ در آوان صبیٰ برحمت حق پیوستند۔ در عرض یک ماہ دو پسر از خواصان تولد یافتند۔ یکے را جہاندار و دیگرے را شہر یار نام نہادم"۔ سلطان دانیال کی اولاد میں بھی کوئی اس نام کا شہزادہ نہ تھا کہ سمجھ لیا جاتا کہ اشتباہ ہو گیا ہوگا۔ دانیال کی اولاد کی تفصیل یہ ہے۔ طہورث، ہوشنگ اور بالسنقر یا بایسنغر نامی تین بیٹے۔ اور سعادت بانو، بولاقی بیگم (اخت ہوشنگ) اور برہانی بیگم (ہمشیر طہورث) چار بیٹیاں۔ اس مغالطے کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال شہر یار دانیال کا نہیں بلکہ جہانگیر کا ہی بیٹا تھا اور کسی مشہور و معروف بیگم کے بطن سے نہ تھا بلکہ خود جہانگیر کے بیان کے موافق خواص زادہ تھا۔ ممکن ہے کہ غیر مسلم حضرات یہ پڑھ کر چونک

پڑیں کہ نور جہاں جہانگیر کے عقد میں۔ شہریار جہانگیر کا بیٹا پھر کس طرح شہریار اور بنت نور جہاں کا ایک دوسرے کے ساتھ عقد ہو گیا۔ اس لیے یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں اس قسم کا نکاح جائز ہے۔ اور یہ ایک اصولی بات ہے نور جہاں کی وہ لڑکی شیر افگن خان سے تھی اور جہانگیر کا یہ بیٹا دوسری بی بی سے۔ یہ دونوں شریک رضاعت نہ تھے۔ باپ الگ ماں الگ۔ پھر نکاح ہو جانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔

1037ھ/ 1627ء میں جہانگیر مقام مار گلے یا بیرم کلہ کے قریب مصروف شکار تھا۔ ایک لڑکا سامنے کی پہاڑیوں پر ہرنوں کو گھیر گھیر کر لا رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اس نے ایک درخت کو پکڑا وہ ٹوٹ گیا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے گرا، گر کر مر گیا۔ جہانگیر کی طبیعت اس واقعہ سے بہت ہی بے لطف ہوئی۔ محل سرا کو واپس آیا اور تیسرے دن مر گیا۔ شہریار ان دنوں بیمار تھا۔ داء الثعلب (گنج) کی وجہ سے اس کی داڑھی مونچھ کے بال گر گئے تھے۔ اور آتشک کی تاب سے چھالے پڑ گئے تھے اس لیے پہلے سے لاہور پہنچ گیا تھا۔ بی بی ساتھ تھی، اس کے مشورے سے خود کو خواہ مخواہ کا بادشاہ مشہور کر کے خزائن لاہور پر قابض ہو کر قریب ستر لاکھ روپے انعام و اکرام اور جمع افواج میں تقسیم کر ڈالا۔ لشکر کا ایک کافی حصہ بالیسنغر بن دانیال بن اکبر کی سرکردگی میں راوی پار بھیج دیا اور خود دو تین ہزار سوار اور پیادوں کے ساتھ شہر میں قیام کیا۔

ادھر نور جہاں نے بھائی (آصف خاں) کو بلا کر اپنے داماد کو بادشاہ بنانے کا مشورہ کیا۔ آصف خاں نے اسے بالے بتے دیے اور اس کو مع اس کی دوسری بہن اور اس کے شوہر کے کہ اس کا ہم خیال تھا نظر بند کر کے داور بخش بن خسرو کو عارضی بادشاہ بنا کر مقصود خاں کے ساتھ جہانگیر کی نعش کو لاہور روانہ کر کے، شاہجہاں کو خبر مرگ جہانگیر دے کر اور اسے دکن سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے کا اشارہ کر کے خود داور بخش کی رکاب میں لاہور کی طرف کوچ کیا۔ چونکہ وہ بدل شاہجہاں کی سلطنت کا خواہاں اور صاحب اثر تھا، قریب قریب تمام سردار اسی کے جانب دار تھے۔

لاہور سے تین کوس کے فاصلہ پر داور بخش اور شہریار کے لشکروں میں لڑائی ہوئی۔ شہریار شکست کھا کر قلعہ لاہور میں آیا۔ رات کے وقت ارادت خان بن مرزا عزیز کوکلتاش خاں اعظم نے قلعہ میں پہنچ کر اسے رام کر لیا۔ صبح کو امرا داور بخش کو لے کر قلعہ میں پہنچ گئے اور اسے تخت پر بٹھالا، شیدی فیروز خان خواجہ سرا نے شہریار کو پکڑ کر الہ وردی خان کے سپرد کر دیا۔ اور وہ دست بستہ شہریار کو داور بخش کے سامنے لایا۔ کورنش کرائی۔ دو تین دن کے بعد

شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور وہ اندھا کر دیا گیا۔شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی۔

ز نرگس گلاب از چہ نتواں کشید کشید ند از نرگس من گلاب
اگر از تو پُر سند تاریخ من بگو کور شد دیدۂ آفتاب

1037ھ

یہی تاریخ تاریخ وفات ہوئی کیونکہ 25 جمادی الاول 1037ھ/1637 شاہجہاں کے اشارے سے آصف خان نے عارضی بادشاہ داور بخش، اس کے بھائی گشتاسپ (ابنائے خسرو نظورث، ہوشنگ اور مرزا بائیسنغر (ابنائے دانیال) کے ساتھ ہی ساتھ شہریار کو بھی عین جوانی میں رضا بہادر الخاطب بہ خدمت پرست خان کے ہاتھوں لاہور میں قتل کروادیا۔نعشوں تک کا پتہ نہ چلا۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شاہجہاں کے لیے بساط سلطنت خالی ہوگئی اور اس نے زمام حکومت ہاتھ میں لے کر حکمرانی کرنا شروع کردی۔

شہریار اچھا خاصہ تعلیم یافتہ، بہادر اور سخی طبیعت شہزادہ تھا۔وہ بے حد حسین تھا۔لیکن جتنا ہی حسین تھا اتنا ہی بیوقوف بھی تھا۔اس نے باپ کی تقلید کی۔یعنی خود کو بی بی کے ہاتھ میں دے دیا،لیکن نبھا نہ سکا۔اس کے ناعاقبت اندیش ہونے میں کلام نہیں۔

(ماخوذ از سیر المتاخرین، بادشاہ نامہ، ماثر الامرا،ظفر نامہ شاہجہاں،کارنامہ جہانگیر،قصص ہند آزاد، سیر المتاخرین،تزک جہانگیری، قاموس المشاہیر، ہسٹری آف جہانگیر۔بنی پرشاد ہسٹری آف انڈیا اسمتھ ،اور اورینٹل سائگرفیکل ڈکشنری)

نوٹ نمبر 2۔نور جہاں۔مہر النسا نام،نورمحل اور نور جہاں خطاب،اعتماد الدولہ نواب مرزا غیاث بیگ طہرانی کی بیٹی۔آصف خان خان خاناں کی بہن اور جہانگیر کی شہرآفاق ملکہ تھی۔اعتماد الدولہ کا خاندان دولت مغلیہ میں وہی منزلت رکھتا تھا جو دولت بنو عباسیہ بغداد میں برمکی خاندان۔مگر خاندان برمک سیاسیات کی پیچیدگیوں میں پڑ کر چن چن کر قتل کیا گیا اور اس خاندان نے از ابتدا تا انتہا نہایت غرور و وقار کی زندگی بسر کی اور اس کے غلام تک خانی و ترخانی کے خطاب پا کر بڑے بڑے امرا پر سبقت لے گئے۔اس خاندان کی دو بیگمات (ارجمند بانو بیگم المعروف

بہ ممتاز محل اور مہر النساء المخاطب بہ نور جہاں) دولت مغلیہ کے دو جلیل القدر فرمانرواؤں یعنی شاہجہاں اور جہانگیر کے حبالۂ عقد میں رہ کر ان بادشاہوں کے پردے میں خود حکومت کر گئیں اور بڑی شان کے ساتھ کر گئیں۔ نور جہاں 1577 میں جبکہ اس کا باپ انتہائی افلاس و پریشانی میں ایران سے ہندوستان کا سفر تلاش معاش میں کر رہا تھا، جنگل میں پیدا ہوئی۔ اس کے باپ نے اپنے جوہر ذاتی کی بدولت دربار اکبری میں رفتہ رفتہ بڑا مرتبہ حاصل کیا۔ اس کا دور شباب تھا کہ جہانگیر مرمٹا۔ اکبر نے مصلحتاً اس کا عقد شیر افگن خان کے ساتھ (جس کے حالات انہی حواشی کے ذیل میں درج ہیں) کر دیا۔ مگر جہانگیر نے تخت نشین ہو کر اس کے خاوند کے مارے جانے پر اپنے عقد میں لے لیا اور بادشاہ پر یہ اس قدر حاوی ہوئی کہ درحقیقت وہی حکمران ہند تھی۔ سکوں پر اس کا نام ثبت ہوتا تھا۔ صرف خطبہ میں اس کا نام نہیں لیا گیا ورنہ اس کا نام تمام کاروبار سلطنت میں شریک تھا۔

وہ بے حد حسین، عقلمند، بہادر، حاضر جواب تھی۔ مخفی تخلص کرتی اور شعر کہتی تھی۔ ایجاد پسند طبیعت رکھتی اور مختلف چیزوں کی موجد تھی۔ مثلاً مچھر دانی، بیگماتی پائجامہ، پناپئی کی گوٹ وغیرہ وغیرہ زیورات میں اس نے بہت سی دلچسپ ایجاد و اختراع کیے تھے۔ یورپ سے جو زیورات آتے ہیں ان میں بیشتر اسی کے ترمیم یا ایجاد کردہ ہیں۔ عطر گلاب کی ایجاد مؤرخین کی غلطی سے اس کے نام سے منسوب ہے۔ دراصل یہ اس کی ماں "دیوانجی بیگم" کی ایجاد ہے۔

چونکہ اس کی بیٹی جو شیر افگن خان کے صلب سے تھی، جہانگیر کے بیٹے شہریار کو بیاہی تھی اس لیے اس کی بہت طرفداری کرتی اور اپنے بھائی کے داماد شاہجہاں کو بوجہ شریک و سہیم سلطنت ہونے کے اکثر تنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ دھولپور کو کہ شاہجہاں کی جاگیر میں تھا شہریار کے نام پر منتقل کر دیا تھا اسی بنا پر شاہجہاں جہانگیر سے باغی ہوا۔ آخر میں جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہاں کو ہی کامیابی ہوئی اور وہ تاجدار ہند بنا اور نور جہاں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ یعنی 25 لاکھ روپے سالانہ اس کی پنشن مقرر کر دی اور اس کے آخری دم تک اس کے ساتھ عزت و حرمت کا برتاؤ کرتا رہا۔

نور جہاں جہانگیر کی وفات کے بعد بارہ برس تک شاہجہاں کی پنشن خوار رہ کر 1049ھ/1639ء رہ گرائے عالم باقی ہوئی۔ اس مدت میں وہ جہانگیر کا سوگ مناتی رہی اور اس کی یاد میں کبھی رنگین کپڑا اپنے جسم سے مس نہ کیا۔ لاہور میں اپنے رفیق حیات جہانگیر کے پہلو میں مدفون ہوئی (تقصص ہند آزاد، دربار اکبری، قاموس

المشاہیر، اورینٹل بیل، ظفر نامہ)۔12

نوٹ نمبر3۔ آصف خان: مرزا ابوالحسن نام، اعتماد الدولہ مرزا غیاث کا بیٹا نور جہاں کا بھائی تھا۔ جہانگیر نے نور جہاں کے عقد کے بعد اعتقاد خان پھر 6 ج میں آصف خان خطاب دیا۔ آصف جاہ و آصف جاہی بھی کہلاتا تھا۔ شاہجہاں نے یمین الدولہ خان خاناں خطاب دیا 1030ھ/ 1621 میں جہانگیر نے اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس کی لڑکی ارجمند بانو بیگم جو عوام میں ممتاز محل، تاج بی بی نواب عالیہ اور قدسیہ بیگم مشہور ہے، شاہجہان کی بی بی تھی۔ 17 شعبان 1051ھ 10 نومبر 1641 بہ عمر ستر سال یا بہتر سال انتقال کیا۔ شہر لاہور کے بالکل مقابل دریائے راوی کے کنارے مدفون ہوا۔ شائستہ خان، مرزا مسیح، مرزا حسین اور نوشہ نواز خاں چار یادگاریں چھوڑیں۔ جو باپ کی طرح صاحب عزت و وقار ہوئیں۔ علم سے بہرۂ کامل رکھتا تھا۔ معقولات میں ید طولیٰ حاصل کیا تھا یہی وجہ ہے کہ فرامین شاہی میں اسے ان القاب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ ''شعلہ افروز فطرت اشراقیاں و دانش آموز طبیعت مشائیاں'' خوش نویس، درست محاورہ، سیاق داں، معاملہ فہم، ملائم، متواضع اور مردم شناس امیر تھا (ماثر قاموس)

نوٹ نمبر4۔ شیر افگن خان:۔ علی قلی نام قوم استجلو سے تھا۔ یہ شخص پہلے شاہ اسماعیل ثانی بن شاہ طہماسپ شاہ ایران کے نعمت خانہ کا داروغہ تھا۔ شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد انقلاب سلطنت سے اکبر کے عہد میں براہ قندھار ہندوستان پہنچا۔ امیر الامرا خان خاناں عبدالرحیم خان اس زمانہ میں مہم ٹھٹھ میں مصروف تھا۔ علی قلی نے بمقام ملتان اس کے حضور میں شرف باریابی پایا۔ چونکہ جوان، خوش رو اور صاحب ہنر سپاہی تھا۔ اس لیے خان خاناں نے بلا اجازت سلک ملازمان شاہی میں شامل کرلیا۔ اس مہم میں علی قلی سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے۔ بعد فتح ٹھٹھ خان خاناں نے اسے دربار شاہی میں پیش کر کے اکبر سے اس کو اس کے لائق منصب دلوادیا۔ اسی زمانہ میں مہر النسا بنت مرزا غیاث بیگ (جو بعد میں نور جہاں ہو کر دنیا میں چمکی) پر شباب پھٹ پڑا۔ اس کے سادہ و پرفن حسن اور اس کی بھولی بھالی اداؤں نے ولی عہد سلطنت شاہزادہ سلیم (المعروف بہ شہنشاہ جہانگیر) کے مرغ دل کو شکار کرلیا وضع دار اور نیک نیت اکبر نے مہر النسا کے عقد کو سلیم کے ساتھ اپنی شان شاہانہ کے خلاف سمجھ کر اور یہ جان کر کہ امرا کی بہو بیٹیاں نظر بد سے بچانے کے لیے بیگمات شاہی کے مساوی ہیں۔ اسے علی قلی سے منسوب کردیا۔ شہزادہ سلیم نے مرزا غیاث پر دباؤ ڈالا۔ اس نے یہ عذر کر کے پیچھا چھڑا لیا کہ مجھ میں فرمان شاہی سے سرتابی کی مجال نہیں۔ چند روز بعد اکبر نے علی قلی و مہر النسا کا عقد کر کے علی قلی کو بردوان میں جاگیر دے کر اور اس کو ڈھاکہ کا حاکم بنا کر

رخصت کر دیا۔

یہاں حضرت عشق رنگ لائے۔ سلیم نے باپ سے بغاوت کی اور ابوالفضل کو کہ عقد نہ کرنے کے مشورے میں بھی شریک تھا قتل کرادیا۔ آخر بوڑھا اور مرگ اولاد کے صدمے اٹھایا ہوا اکبر دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور بیٹے کی جہانگیری کے لیے میدان خالی کر گیا۔

سلطان سلیم نے جہانگیر کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ اور کچھ ایسی الجھنوں میں پڑا کہ مہر النسا کا عشق افسانہ خواب بن گیا۔ اسی زمانہ میں علی قلی نے تلوار سے شیر کا شکار کیا اور حضور شاہی سے اس کو شیر افگن خان کا معزز خطاب ملا۔

کچھ دنوں بعد وہ بادشاہ سے مشکوک ہو کر اور خدمات شاہی سے مستعفی ہو کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔

1014ھ میں بادشاہ نے اپنے رضاعی بھائی شیخ جیون الخاطب نواب قطب الدین کوکہ (دختر زادۂ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ) کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔ وہ ایک دن بردوان گیا شیر افگن خان نے اس کی آمد کی خبر پا کر اس کا استقبال کیا۔ شیخ موصوف نے دوران ملاقات کہا۔ "اگر تم مہر النسا کو طلاق دے کر اس کا عقد بادشاہ سے کر دو تو مناسب ہے۔" شیر افگن خان نے شیخ پر اچانک حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا اور شیخ کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا شیر افگن خان نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ کچھ کو مارا کچھ کو زخمی کیا۔ لیکن خود بھی زخمی ہو گیا۔ اور چاہا کہ بھاگ کر حرم سرا میں پہنچے اور مایہ فساد و عناد (مہر النسا) کو قتل کر کے اطمینان سے جان دے۔ مہر النسا اپنی خلقی دانائی سے معاملہ کی تہہ کو پہنچ گئی۔ دروازے بند کرا دیے۔ یہاں تک کہ شیخ کے آدمیوں نے شیر افگن خاں کو گھیر کر مار ڈالا۔ تمام مال و اسباب حسب دستور سلطنت ضبط کر کے مع مہر النسا اور اس کی لڑکی کے پایہ تخت کو روانہ کر دیا گیا وہاں مہر النسا، خدیجۃ الزمانی، رقیہ سلطانہ بیگم یا بقول بعض سلیمہ سلطان بیگم (مادران جہانگیر) کی نگرانی میں دے دی گئی۔

عرصے تک وہ بادشاہ کے ساتھ شادی کرنے پر رضا مند نہ ہوئی۔ لیکن آخر کار تاج و تخت کو ٹھکرانا مناسب نہ جان کر اس نے 1020 میں جہانگیر سے عقد کر لیا اور پہلے "نور محل" پھر "نور جہاں" خطاب پا کر دولت تیموریہ میں اپنے خاندان کی وہ وقعت کرا دی۔ جو بنی عباسیہ کے عہد میں برامکہ کو بھی میسر نہ آئی۔

شیر افگن خان ایک حسین، وضعدار، باغیرت، آداب محفل کا ماہر، علم مجلسی میں کامل، بہادر اور شیر دل نوجوان تھا۔ اسے فن نجوم میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ چھت پر کھڑا ستاروں کی سیر کر رہا

تھا۔نور جہاں پاس کھڑی تھی اس نے کہاذ را میرے متعلق تو دیکھو۔تھوڑی دیر غور کرنے اورزائچے پر نظر ڈالنے کے بعد شیر افگن خان نے کہا ''بیگم! میں چتر شاہی کوتمھاری سر پر نثار ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں'' نور جہان نے باتوں ہی باتوں میں ٹال دیا۔لیکن اس واقعے کے بعد وہ اکثر فکر مند رہتا تھااور نور جہاں بھی گھبرایا کرتی تھی۔

بہت سے مورخین نے جہانگیر کواس معاملہ میں بھی بدنام اور شیر افگن خان کے قتل کواسی کے اشارے پر محمول کیا ہے۔اس مختصر میں اتنی گنجائش کہاں کہ نقد وتبصرۂ واقعات کیا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسا نہ تھا۔جو یائے تفصیل کو کارنامہ جہانگیری (یعنی جلد ہشتم تاریخ ہند شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم) کا تتمہ دیکھنا چاہیے۔جس میں خصوصیت کے ساتھ اس امر پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

(کارنامہ جہانگیری۔ہسٹری آف جہانگیری مصنفہ بنی پرشاد ایم اے۔قاموس المشاہیر۔حیات نور جہاں مصنفہ محمد الدین فوق۔دربار اکبری آزاد مرحوم۔تاریخ ہند ای مارسڈن۔قصص ہند آزاد)

جہانگیر کی وفات اوراس کے پسماندوں میں کشمکش

ان تعلقات نے 1037ھ میں جہانگیر کی رحلت کے بعد ایک خوفناک صورت اختیار کی آصف خان ونور جہاں (بھائی بہن) میں ایک عجیب کشمکش رونما ہوئی۔ہر ایک نے اپنے اپنے گھر میں حصول سلطنت کے لیے علاحدہ علاحدہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔امراواعیان دولت بھی علیٰ قدر تعلق واغراض ان دو میں سے کسی نہ کسی کے شریک ہو گئے اورانجام یہ ہوا کہ چند امرا کی مدد سے بھائی نے بہن کونظر بند شہر یار کو مقید اور خسرو (بن جہانگیر) کے بیٹے داور بخش 1 کو مصلحتاً تخت نشین کر کے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اور زبانی جہانگیر کے انتقال کی خبر دکن میں شاہزادہ خورم کے پاس بناری 2 داس کی معرفت بھیجی۔

یہ برقدم وصبا رفتار پیکِ نیک شگون منزل چکرہٹی سے جو وسط کشمیر میں ہے روانہ ہو کر رواں، دواں، پراں شب و روز مسافت طے کرتا ہوا بیس روز کے عرصہ میں 19 ربیع الاول 1037ھ کو جنیر (جو سرحد نظام کی انتہا پر ہے) جا پہنچا اور آصف خان کی ہدایت کے موافق مہابت 3 خان سے جو وہاں موجود تھا،عرض حال کیا۔مہابت 4 خان نے فوراً مشکوئے معلیٰ میں خبر

بھیجی، شاہزادہ محل سے برآمد ہوا۔ بنارسی داس نے آصف خان کی مہر پیش کی اور اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع دی۔

نوجوان شاہزادہ پر اس دل خراش اور جگر دوز خبر سے کوہ غم ٹوٹ پڑا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ باپ کا سایہ سر پر نہیں۔ نظم سلطنت میں اختلال پیدا ہوگیا۔ باغی، غادر، خائن، خود غرض اہل خاندان وارا کین سلطنت جن کی قوت واقتدار نے قہرمانی کا درجہ حاصل کرلیا ہے اپنی شاطرانہ حرفتوں سے سلطنت کو ذاتی ترقیوں اور ہوس پرستیوں کی آماجگاہ بنانے کے لیے تیار ہیں خود اپنے کو روکتا ہے۔ تو باپ دادا کی بنی بنائی سلطنت مٹی جاتی ہے۔ آگے قدم بڑھاتا ہے تو خانہ جنگی کا وہ سیلاب عظیم پیش نگاہ ہے۔ جس سے سلطنت ایک حباب نظر آتی ہے غرضیکہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ خود ورطۂ حیرت واستعجاب میں غرق ہے کہ دوراندیشی، صبر اور استقلال کے فرشتوں نے فوراً آگے بڑھ کر کان میں کہا۔ "یہ موقع رنج وغم کا نہیں۔ اگر آپ اس صدمے سے اپنا برا حال کریں گے تو رعایا جو ودیعت ایزدی ہے۔ پریشان، تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ قدرت کو ابھی آپ سے بہت سے کام لینا ہیں۔ ضبط کیجیے اور جلد از جلد دارالخلافہ میں پہنچ کر زمام سلطنت دست حق پرست میں سنبھالیے خدانخواستہ نوع دگر ہوا اور دراندازوں کو موقع ہاتھ آگیا تو کچھ بنائے نہ بن پڑے گی۔ یہاں اور وہاں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ آل تیمور کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

نوٹ نمبر 1: داور بخش: داور بخش سلطان نام، مرزا بلاقی عرف خسرو کا بیٹا، جہانگیر کا پوتا، خان اعظم کوکلتاش خان مرزا عزیز کا نواسہ تھا۔ نور جہاں نے اسے شہریار کے پاس نظر بند کر دیا تھا جہانگیر کی رحلت کے بعد آصف خان نے جو مستقل طور پر شاہجہاں کی تخت نشینی کا حامی تھا۔ اس کے ماموں ارادت خان کی مدد سے عارضی طور پر تخت نشین کر دیا تھا۔ شہریار بھی دعوے دار سلطنت تھا۔ اس لیے اس کے اور داور بخش کے مابین جنگ ہوئی۔ شہریار شکست کھا کر گرفتار ہوگیا۔ 25 جمادی الاول 1037ھ/ 1627 کو شاہجہاں کے اشارے سے آصف خان نے داور بخش، اس کے بھائی گشتاسپ پسران دانیال (طہمورث)، ہوشنگ اور بایسنغر اور شہریار کو قتل کرا دیا (ظفر نامہ شاہجہاں آثر الامرا۔ قاموس المشاہیر)

نوٹ نمبر 2۔ بناری داس: مشرف فیل خانہ شاہی، تیز دوی وسبک روی میں یکتائے عصر تھا (دیکھو بادشاہ نامہ۔ مآثر اور ظفر نامہ) لیکن مولانا آزاد مرحوم نے قصص ہند میں اس کا نام "مہتا بناری" اور اس کو ایک ہرکارہ لکھا ہے۔ اور تحریر کیا ہے کہ ایک اشرفی کوس تو اس کو اسی وقت دیا گیا تھا۔ اور انعام واکرام کا وعدہ الگ تھا۔ اس نازک موقع پر اس کے بھیجے جانے سے اس کا معتبر ہونا ظاہر ہے اور تیز دوی کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ دو مہینے کی منزلیں بیس 20 دن میں اس نے طے کر ڈالی تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ پہلے ایک ہرکارہ ہی ہو۔ مگر اس خدمت کی انجام دہی کے صلہ میں بہ عہد شاہجہان مشرف فیل خانہ بنایا گیا ہو۔ 12

نوٹ نمبر 3: ظفر نامہ شاہجہاں۔ سیر المتاخرین۔ 12

نوٹ نمبر 4۔ مہابت خان۔ زمانہ بیگ نام، اس کا باپ غیور بیگ جو باشندہ کابل اور صحیح النسب سادات رضویہ سے تھا۔ پہلے مرزا محمد حکیم (برادر اکبر) کا ملازم تھا۔ بعدہٗ اس نے اکبر کی ملازمت کر لی تھی۔ زمانہ بیگ بچپن میں احدیان جہانگیر کے سلسلہ میں منسلک ہوا اور بہت جلد حسن خدمات کے باعث بخشی شاگرد پیشہ کے عہدے پر پہنچ گیا۔ عالم شہزادگی و بغاوت میں جہانگیر نے کسی کارنمایاں پر اسے مہابت خاں خطاب دیا اور بادشاہ ہونے پر اس کی بڑی قدر افزائی کی 1035ھ/1626 میں اس نے نور جہاں کے اثر اور اس کے بادشاہ کے مزاج میں حد سے زیادہ دخیل ہو جانے کی وجہ سے تنگ آ کر جہانگیر کو نظر بند کر لیا۔ نور جہاں اپنے شوہر کی خاطر لڑی اور کچھ ہی دن بعد جہانگیر آزاد ہو گیا۔ نور جہاں اور شاہجہاں کے مابین جب کدورت پیدا ہوئی تو یہ شاہجہان کی گوشالی پر دربار شاہی سے متعین ہوا۔ آخر کار جہانگیر کی جہانگیری کو ختم اور نور جہاں کی شمع اقبال کو بے نور ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کی دور اندیشی نے اسے شاہجہاں کا خیر خواہ بنا دیا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ خواجہ اجمیری و خواجہ غریب نواز کے مزار پر انوار پر شاہجہاں کی وفاداری کا عہد کیا۔ 1ج شاہجہانی میں خطاب خان خاناں، سپہ سالاری، منصب ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار اور صوبہ اجمیر کی صوبہ داری پائی۔ 5ج میں دہلی کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ برہانپور (دکن) میں تھا کہ مرض بھگندر میں مبتلا ہوا، بد پرہیزی وبال جان ہوئی اور 1045ھ /1635 میں وفات پائی۔ تاریخ ہوئی۔ ع زمانہ آرام گرفت

1045ھ

حسب وصیت اس کی لاش کو اس کی معتمد اور وفا شعار راجپوت فوج نے دہلی پہنچایا۔ جہاں وہ شاہ

مردان کے قریب دفن کی گئی۔

مہابت خان جوتش (نجوم) کا ماہر تھا۔ایرانیوں کی صحبت بہت پسند کرتا تھا۔ابتداءً اس کا کوئی مذہب نہ تھا۔لیکن آخر میں مذہب امامیہ کا پیرو ہو گیا تھا۔صوم وصلوٰۃ کا پابند نہ تھا۔جس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا کچھ بھی ہو جاتا بے رخی نہ کرتا اور اس کی ذلت گوارانہ کرتا تھا۔اس درجہ کریم الطبع اور سادہ مزاج تھا کہ باوجود ایک کروڑ روپیہ سالانہ کے سب روپیہ صرف کر ڈالتا اور ساری پوشاک جو خود زیب تن کرتا پانچ روپیہ سے زیادہ کی نہ ہوتی تھی۔اپنے کاروبار سے بے خبر رہتا۔لیکن معاملات سرکاری میں سخت اور جزرس تھا۔شاعر تھا۔لیکن اظہار شاعری کو معیوب ومکروہ جانتا تھا۔اس کا شعر ہے۔

تنگ دلم بود کہ بہشت آرزو کند　　　دوزخ نصیب من بود و آرزو مباد

غرض یہ کہ بہت اچھا،ہر دلعزیز اور جامع کمالات سردار تھا۔بے عیب ونقص صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ کیونکر خالی رہتا کہ انسان تھا۔ظلم اور درندگی کے دھبوں سے اس کا دامن آلودہ ہے۔

پانچ بیٹوں میں سے دو (مرزا امان اللہ المتخلص بہ امانی اور لہراسپ مہابت خان) باپ کے قدم بہ قدم چل کر نام کی زندگی کا باعث ہوئے۔باقی تین نے کوئی خاص ترقی نہ کی اور گمنام شہر خاموشاں میں جا بسے۔

مہابت خان نے آگرہ میں جمنا کے کنارے پچاس بیگہ زمین پر ایک عمارت اپنے رہنے کے لیے بنائی تھی۔جس کے کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔(ماخوذ از قاموس المشاہیر، اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری، مآثر الامرا، بادشاہ نامہ، تاریخ ہند مصنفہ ونسنٹ اسمتھ، سوانح جہانگیر مصنفہ بینی پرشاد ایم اے قصص ہند آزاد اور حیات نور جہاں)۔12

ہوا پرستان سلطنت مغلیہ کا قتل اور شاہجہاں کی تاجپوشی

مستقل مزاج، عالی حوصلہ اور جوان ہمت شاہزادے نے ان حقیقی اور سچے غیبی نصیحت کرنے والوں کے پند ونصائح کے سامنے سر تسلیم ورضا خم کر دیا اور ظل اللہ کے سایۂ عاطفت کے اٹھ جانے اور واقعات وحالات کے پیچ در پیچ ہو جانے کی وجہ سے ٹوٹتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے 23۔ربیع الاول 1037ھ کو نجومیوں کی مہورت کے موافق گجرات کی

راہ سے آگرہ 1 کا رخ کیا 2۔ نرمدا کو عبور کر کے اپنا ایک ہراول آصف خاں کے پاس بھیجا۔ رموز و اشارات نے پردے پردے میں کام کیا۔ اور خاندان اکبری کے ہوا پرستانِ سلطنت سیاسیات کا شکار ہو کر مصالح ملکی کے دیوتا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ 3 اب خورم کے لیے میدان صاف تھا۔ اس لیے کہ آصف خاں جیسے زبردست شاطر نے بساط حکمرانی پہلے ہی سے خالی کر رکھی تھی۔ لہٰذا آگرہ پہنچ کر بروز دو شنبہ 27 جمادی الاول 1037ھ = 1628 کو چھتیس سال کی عمر میں ''شہاب الدین محمد شاہجہاں'' کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوس کیا 4۔

لطیفہ 5۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی دن بعد سلطان روم نے اسے ایک خط میں لکھا۔ ''آپ صرف ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ پھر آپ نے لقب شاہجہاں کیوں اختیار کیا؟'' شاہجہاں کو بھی خیال پیدا ہوا کہ یہ غلط بیانی ہے اور یمین الدولہ (آصف خان) سے کہا۔ ''کوئی اور لقب اختیار کرنا چاہیے۔ ملک الشعرا، ابو طالب 6، کلیم، ہمدانی کو جو خبر ہوئی تو اس نے اسی وقت قصیدہ لکھ کر حضور میں پیش کیا۔ جس میں لقب کی یہ توجیہ کی۔

ہند و جہاں 59 ز روئے عدد ہر دو چوں یکست — شہ را خطاب شاہجہانی مبرہن است

یعنی ہند اور جہاں دونوں لفظوں کے عدد ایک (59) ہیں، اس لیے شاہ ہند کو شاہجہاں کہہ سکتے ہیں۔

نوٹ نمبر 1۔ آگرہ۔ بقول واحد یار خاں بی اے (صاحب ''ارض تاج'') اس شہر کی وجہ تسمیہ بھی مورخین کے اختلافات کی ایک عجیب و غریب جولانگاہ ہے۔

کوئی کہتا ہے ''اگر'' ظرف نمک سازی کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ وہاں نمک سازی ہوتی تھی اس لیے یہ نام پیدا ہوا۔

بعض کا خیال ہے کہ لفظ ''اگلا'' یا ''آگرہ'' یعنی قدیم سے منسوب ہے۔

بعض کا بیان ہے کہ آگرہ کے معنی گھر ہیں۔ بعض اگروال بنیوں کے اس شہر کو بسانے کے باعث اس کا نام آگرہ بتلاتے ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح کیا ہے۔

اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت تک یہ شہر اسی نام سے موسوم رہا۔ مگر شاہجہاں نے

حسب روایت بادشاہ نامہ اس لفظ کو بے معنی سمجھ کر اکبرآباد نام رکھا جو کاغذات شاہی میں تو مدتوں زندہ رہا لیکن عوام کی زبانوں پر نہ چڑھ سکا۔ جب بھی آگرہ تھا اور اب بھی آگرہ ہے۔

نوٹ نمبر 2۔ظفرنامہ۔کارنامہ جہانگیری۔سیر 12

نوٹ نمبر 3۔ظفرنامہ وقاموس المشاہیر۔12

نوٹ نمبر 4۔لین پول۔ظفرنامہ۔12

نوٹ نمبر 5۔شعرالعجم حصہ سویم مصنفہ مولانا شبلی مرحوم۔ نیز دیکھو" حیات صالح" مصنفہ منشی سعید احمد ماہروی (صاحب امرائے ہنود) جہاں یہ لطیفہ علامی نواب سعداللہ خاں چنیوٹی وزیر شاہجہاں (المتوفی 1066ھ/1656) کی طرف قبل عطائے منصب وزارت کے واقعات میں منسوب ہیں۔ میں مولانا شبلی مرحوم کی تحقیق سے متفق ہوں۔ کیونکہ مولانا نے جہاں یہ لطیفہ درج کیا ہے وہیں ذیلی حواشی میں اس کا ماخذ کلمات الشعرائے سرخوش کو ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے "لیکن سرخوش نے دوسرا مصرع جس طرح نقل کیا ہے دیوان میں نہیں۔ اس لیے میں نے دیوان کے مطابق نقل کیا ہے"۔ جس سے یہ امر بخوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ شعر طالب کلیم ہی کا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے دیوان میں کیونکر داخل ہوجاتا۔ دیوان طالب کلیم اور تذکرہ سرخوش کے مابین صرف دوسرا مصرعہ مختلف فیہ ہے۔ پہلے میں اختلاف نہیں، اور اصل توجیہ لقب (ہند و جہاں کا ہم عدد ہونا) پہلے ہی مصرعے میں ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس پورے شعر کو ابو طالب کلیم کی حاضر جوابی کا ثمرہ نہ سمجھیں۔ یا اس واقعہ کو اس کی طرف منسوب نہ کریں۔12

نوٹ نمبر 6۔ابو طالب کلیم۔ ہمدان کا رہنے والا تھا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، اور شاہنواز خاں صفوی (عالمگیر کے خسر یعنی شہزادی زیب النساء اور شہزادہ محمد اعظم کے نانا) کے دربار میں رسائی پیدا کی۔1028ھ میں وطن کو واپس کیا۔ دو برس بعد پھر آیا، اور میر جملہ شہرستانی کا دامن پکڑا۔ لیکن دربار تک رسائی میسر نہ آئی۔ اس کے رسائی دربار میں ناکام رہنے کے دو وجوہ تھے۔ ایک تو یہ کہ ملک الشعرائے دربار جہانگیری طالب آملی کے سامنے اس کی شاعری فروغ نہیں پاتی تھی۔ دوسرے نور جہاں اس کی شاعری کی معتقد نہ تھی بلکہ الٹے اس پر اعتراض اور کیا کرتی تھی۔

لطیفہ۔ایک دفعہ کلیم نے ایک شعر کہااور خوب دیکھ بھال لیا کہ کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔

زشرم آب شدم کاب را شکستے نیست　　بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

اور نور جہاں کی خدمت میں بھیجا۔وہ فوراً بول اٹھی "یخ بست و پس بشکست" یہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا

1028ھ میں پھر وطن واپس گیا، اور تیسری مرتبہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان پہنچا۔رفتہ رفتہ اس کے دربار میں رسائی ہو گئی اور اس کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا۔1061ھ میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوا۔

بعض لوگوں نے اسے اور سعیدائے گیلانی المخاطب بہ بے بدل خان کو ایک سمجھا ہے۔

ہم نے بے بدل خان کے حالات میں حاشیہ نمبر 4 حواشی ص:82 پر رفع اشتباہ کیا ہے۔

طالب کلیم کے کلام میں حسن تعلیل اعلیٰ پیانہ پر موجود ہے۔مثالیہ مضمون کی بنیاد جسے صائب (المتوفی 1080ھ) نے حد کمال پر پہنچایا اسی کی ڈالی ہوئی ہے۔صاحب دیوان ہے۔کلام کا اندازہ ان دو شعروں سے کرو۔

وضع جہاں قابل دیدن دوبارہ نیست　　رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

کے بہر نامحرے چاک جگر خواہم نمود　　من کہ زخمش رانہاں از زخم سوزن داشتم

(ماخوذ از شعر العجم، قاموس المشاہیر)

شاہجہاں کا طور وطریقہ

ابتدائی زمانہ میں بمقابلہ اور مغل سلاطین کے شاہجہاں کو خاندانی مخالفین کے صاف کرنے کے علاوہ بیرونی دشمنوں کے الجھاؤ میں کسی خاص انتظام وانصرام کے ساتھ زیادہ عرصے تک پڑے رہنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔اور وہ توسیع سلطنت کا حریص بھی نہ تھا۔بلکہ رعایا کی بہبود اور مملکت کی فلاح کا ایک درد اس کے دل میں تھا جس کی جانب وہ متوجہ رہا اور اس کے صلہ میں منعم حقیقی نے اس کو فراوانی آمدنی اور توسیع وسائل آمدنی سے مالا مال کر دیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ جس سطوت و جبروت، شان وشکوہ، جاہ وجلال اور دبدبہ وقہرمانی کے ساتھ اس نے سلطنت کی اس کی مثال دنیا کے بادشاہوں میں کم ملتی ہے۔ جس کی ایک کیفیت علامہ، آزاد، دہلوی نے جلوس تخت طاؤس کے سلسلہ میں یوں ظاہر کی ہے1۔

''حب جاہ وحشم کے ہجوم کے لیے آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں گنجائش نہ رہی تو دلی میں ایک نیا قلعہ بنوانا شروع کیا کہ قلعہ آگرہ سے دو چند اور لاہور سے چند در چند زیادہ ہو۔ چنانچہ کروڑ روپیہ کی لاگت سے دس برس میں بن کر تیار ہوا۔ میر عمارت نے عرضی لکھی۔ خود بدولت ہوادار آبی پر سوار ہو کر لب دریا کے دروازے سے قلعے میں داخل ہوئے۔ قلعہ کو ملاحظہ کیا سر سے پاؤں تک سنگ سرخ سے گل رنگ، اس پر سنگ مرمر کے حاشیہ کا نرالا ڈھنگ، برجیاں، فصیلیں اور مرغولیں خوشنما، عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دلکشا کہ اگر بے مبالغہ بھی ایک ایک کی تفصیل لکھی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہو جائے۔ کل قلعے کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا ہے۔ غرض کہ جشن کا سامان شروع ہوا۔ دیوان2عام کے سامنے وہ شامیانہ کہ جس کا نام دل3بادل تھا اور دیوان4خاص کے میدان میں سہ منزل خیمہ استادہ ہوا۔ جس کا کلس خیمۂ فلک کے پار نکلا جاتا تھا۔ یہ بھی سات برس کے عرصے میں تیار ہوئے تھے۔ اور ہزاروں گز پشمینے کشمیر کے اور مخمل زرباف گجرات کے ان پر خرچ ہوئے تھے۔ دونوں سونے کے ستونوں اور چاندی کے استادوں پر کھڑے تھے۔ ان کے آگے خوشنما شامیانے اطلسی وزربافی، سنہری روپہلی جوتوں پر تانے گئے۔ ایوان عالی جس طرح طلائی چھت کی مینا کاری سے گوناگوں تھا۔ ویسے ہی ایرانی قالینوں اور بناری کمخوابوں سے بوقلموں تھا۔ صدر سے لے کر پا انداز کے ایک ایک مکان تک در و دیوار کو مخمل زرباف، بادلہ، کمخواب پردہ ہائے فرنگی، دیبائے رومی، اطلس چینی سے نگارخانۂ چیں کر دیا۔ صدر میں تخت طاؤس سجایا۔

تخت طاؤس نمونہ عجائبات دنیا کا تھا۔ کروڑ روپیہ کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے۔ مگر خیال کرنا چاہیے کہ آج اس قدر سونے اور جواہرات کے لیے کس قدر دریا اور پہاڑ الٹنے پڑتے ہیں۔

بارہ(12) مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ مینا کاری کی چھت دھری تھی۔
چھت سے پائے تک خالص کندن اور آبدار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور تین سیڑھی اونچ بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے۔ کہ انگوٹھی پر دھرا ہے۔ اس کی ردکار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا۔ جسے سبزۂ والماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گل رنگ کیا تھا ادھر اُدھر اس کے دو مور رنگا رنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لیے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف چار چتر زر نگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی۔ آگے ایک شامیانہ کہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا۔ اور ایک لاکھ روپیہ کی لاگت میں تیار ہوا تھا۔ سونے روپے کی چوبوں پر استادہ تھا۔ گرد اس کے کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے بچی ہوئی تھیں5۔ تخت کے گرد پاس ادب کے لیے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوشنما لگا تھا کہ جس کی مینا کار جالیاں مرغ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ غرض دربار آراستہ ہوا مگر اقبال کا رعب و داب دیکھ کر قدرت خدا یاد آتی تھی۔ چنانچہ کٹہرے کے باہر اول یمین و یسار شہزادے والا تبار، بعد ان کے راجہ مہاراجہ، ملک ملک کے حاکم، امیر و وزیر اپنے اپنے عہدے لیے کھڑے مگر تمام فرمانبرداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوشِ دل فرمانروا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار مخمل کی غلاف دار بندوقیں کندھوں پر بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لیے بت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان میں اور عہدے دار، منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس کے آگے کے دروں میں تین تین حبشی جیسے کالے کالے پہاڑ آنکھیں لال لال زربفت کی وردیاں پہنے ہتھیاروں میں اوبچی بنے، گرز ہائے فولادی کندھوں پر، بادلے کی بیرقیں ہاتھوں میں۔ تیسرے درجے میں اہلکار اور ہر کار خانے کے کاردار منشی متصدی قلمدان بغل میں، بستے آگے رکھے موجود تھے۔ اور دروں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کیے، قدِ آدم چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا کھڑا کیا تھا اور اس کے برابر سپاہی جن میں دائیں پر ترک، بائیں پر افغانی، سامنے راجپوت اپنی اپنی وردیاں پہنے، روپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لیے جمے تھے6۔

یہاں سے دروازے تک سواروں کے پرے دو دستہ، پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے، پہرے پہرے پر اپنے اپنے نام ونشان بتاتے اور آگے چلے جاتے۔ مگر دبدبے کا یہ عالم تھا کہ ہوش وحواس کے قدم تھراتے تھے۔ دربار میں پہنچ کر تین تسلیم گاہوں پر تسلیم بجالاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا" آداب بجالاؤ! جہاں پناہ بادشاہ سلامت عالم پناہ بادشاہ سلامت!" تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔ غرض اول شاہزادوں کی نذریں گزرنی شروع ہوئیں۔ ہر ایک کو خلعت اور ترقی منصب کے احکام سنائے گئے۔ علامہ سعد 7 اللہ خان وزیر اعظم کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا۔

عبرت۔ دربار میں یہ شان پروردگار آشکار تھی کہ دفعتاً بادشاہ آبدیدہ ہوئے اور دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے، ساتھ ہی سب اہل دربار نے ہاتھ اٹھائے مگر پاس ادب سے کوئی شخص جرأت سوال نہ کرسکا۔ بعد فاتحہ کے خود بادشاہ نے کہا" اے بندگان باخلاص! جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا، اس کا اظہار تم پر بھی واجب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ فرعون 8 نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعویٰ خدائی کا کیا۔ گواہ اور آگاہ ہوا!!! کہ جس نخوت وتکبر سے اس نے وہ دعویٰ کیا تھا۔ میں اس سے لاکھ مرتبہ عجز ونیاز کے ساتھ عبودیت الٰہی کا اقرار کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اٹھا اور دوگانہ شکرانے کا بجالا کر دیر تک پیشانی کو زمین نیاز پر ملتا رہا۔ وقت کی تاثیر سے دربار میں سناٹے کا عالم ہوگیا۔ سب کے دل آب ہوگئے اور سینوں کے ولولوں نے دم گرم سے اس ایوان میں ایک گونج پیدا کی۔ بادشاہ سجدے سے اٹھ کر دوبارہ مسند پر بیٹھا۔" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر خدا پرست تھا۔

نوٹ نمبر 1۔ منقول از "قصص ہند" آزاد مرحوم۔ 12

نوٹ نمبر 2 لغایت 4 کے لیے دیکھو حواشی 182-183 ص: 12-13-14

نوٹ نمبر 5۔ گو مولانا مرحوم نے تھوڑی ہی دور چل کر یہ فرما دیا ہے" اول یمین ویسار شاہزادے...... راجہ مہاراجہ...... حاکم امیر ووزیر اپنے اپنے عہدے لیے کھڑے" لیکن بعض حضرات کو کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے بجی تھیں" یہ فقرہ اس مغالطہ میں ضرور ڈال دے گا کہ دربار مغلیہ میں بعض امرا کو کرسی

نشینی کا شرف حاصل تھا۔ اس لیے اس امر پر تبصرہ کرنا ضرور ہے۔ ورنہ اس زمانہ کی رسم کے خلاف ایک غلط رائے قائم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دراصل ہندوستان میں مغلوں کے عہد تک کرسیاں عام نہ ہوئی تھیں اور ان کے دربار و دفاتر میں یہ شے نادر تھی نہ صرف اہلکار وغیرہ بلکہ بادشاہ بھی بعض مواقع پر مسند تکیہ لگا کر کاروبار سلطنت انجام دیتا تھا۔ چنانچہ برنیر اپنے وقائع سیاحت میں عالمگیر کے سفر کشمیر کے دوران خیمہ ہائے معروف بہ خاص و عام کی کیفیت لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے" اس میں 3-4 انچ موٹے روئی کے گدیلوں کا فرش ہوتا ہے اور ان پر مکلف قالین اور زربفت کی مربع مسندیں آرام سے تکیہ لگا کر بیٹھنے کے لیے بچھی ہوتی ہیں۔

اس رسم دیرینہ کی یادگار باوجود تغیر تمدن و ترقی تہذیب کے دیسی ریاستوں میں کہیں کہیں اب بھی باقی ہے اور وہاں بڑے بڑے حکام اور خود والی ریاست عموماً یا خاص خاص موقعوں پر اب تک مسند تکیے ہی پر اجلاس کرتے ہیں۔

درحقیقت سلاطین مغلیہ کے دربار کا آئین یہ تھا کہ بادشاہ کے سوا دربار میں کوئی بیٹھ نہ سکتا تھا۔ امرا وزرا، اہل خاندان و شاہزادے یہ سب کے سب دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ برنیر نے اپنا چشم دید آئین دربار جو لکھا ہے یہ ہے۔" اس دیوار کے وسط میں جو محل سرا سے اس (یعنی عمارت خاص و عام) کو جدا کرتی ہے۔ قد آدم سے کچھ اونچا ایک وسیع شہ نشین بنا ہوا ہے۔ جہاں ہر روز بادشاہ دوپہر کے قریب آن کر تخت پر بیٹھتا ہے۔ اور دائیں بائیں شاہزادے کھڑے ہوتے اور خواجہ سرا مورچھل ہلاتے اور بڑے بڑے پنکھے جھلتے یا ادائے خدمات کے لیے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اور تخت کے نیچے کے مقام میں چاندی کا جنگلہ لگا ہوا ہے جس میں تمام امرا اور راجہ غیر ملکوں کے سفیر آنکھیں نیچی کیے ہوئے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور تخت سے کسی قدر فاصلہ پر اسی طور سے منصب دار یعنی چھوٹے امرا کھڑے رہتے ہیں اور ان سے جو جگہ خالی رہتی ہے وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگوں اعلیٰ و ادنیٰ مفلس و غنی سے بھرا رہتا ہے" صاحب آثار الصنادید نے دیوان عام کے حالات میں لکھا ہے۔" یہ دالان امرا اور وزرا اور وکلا کے حسب مرتبہ کھڑے رہنے کا ہے"۔ اور عالمگیر نامہ و مآثر عالمگیری سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے امرا کو اعزازاً ایک ایک مرصع چھڑی (عصا) اس غرض سے عطا ہوتی تھی کہ وہ اس کے سہارے سے دربار میں کھڑے رہا کریں۔"

جیسا کہ پرانے زمانے کی تصویروں اور درباری مرقعوں میں بھی دیکھنے میں آتا ہے اور یہ تمام باتیں

آئین مذکور کی دلیلیں ہیں۔

شاہان مغلیہ کے درباروں یا ان کی مخصوص صحبتوں میں اگر کسی کو بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی تو یہ حد درجہ کی شاہی عنایت اور بے انتہا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ صاحب دربار اکبری اکبر کے حالات آئین کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں۔ "بندگان خاص کو جب خلوت میں بار ملتے تھے۔ بیٹھنے کی اجازت پاتے تو سجدۂ نیاز کرتے تھے۔" جہانگیر نے (جیسا کہ ہم متن میں کہیں لکھ چکے ہیں) جب فتح دکن کے صلہ میں شاہزادہ خورم کو "شاہجہاں" کا خطاب اور تخت کے قریب مسند پر بیٹھنے کا اعزاز مرحمت کیا تھا۔ اس موقع پر وہ جہانگیر نامہ میں خود اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ "عنایتے است نمایاں ولطفے است بے پایاں کہ نسبت بآں فرزند سعادت مند ظہور یافت چہ از زمان حضرت صاحب قران تا حال، ہیچ پادشا ہے از یں سلسلہ عالیہ ایں گونہ عنایت سرشار بہ فرزند شائستۂ خود نہ نمودہ"۔ یا حسب روایت صاحب سیر المتاخرین "جب شاہجہاں نے 1064ھ/19ج میں جشن وزن قمری کے موقع پر شاہزادہ دارا شکوہ کو "شاہ بلند اقبال" کا خطاب، خلعت خاصہ اور طلائی کرسی پر (جو تخت شاہی مرصع کے برابر لگائی گئی تھی) بیٹھنے کا اعزاز بخشا ہے۔ تو تمام امرائے دربار کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگ شاہزادے کے محل میں جا کر اس کو اس عزت افزائی کی مبارک باد دیں" اور صاحب "جہاں آرا" (مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کلیم بی اے وکیل) کی تحقیق کے موافق شاہزادی جہاں آرا بیگم المعروف بہ بیگم صاحب کے جشن حصول صحت کے موقع پر جبکہ شاہجہاں بے حد خوش تھا اس نے ان تمام شاہزادوں کو جو تخت شاہی کے گرداگرد کھڑے تھے جوش مسرت میں بیٹھنے کا حکم دے دیا۔ غرض یہ کہ خاص ہی خاص موقعوں پر مغلوں کے دربار میں معززین کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ دربار شاہی میں مسند یا کرسی پر بیٹھ سکیں۔ عموماً شاہزادے اپنے ذاتی دربار تک مسند ہی پر کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ محمد حسین صاحب نے وقائع سیاحت برنیر مترجمہ خود کے حواشی میں اس موقع پر کہ جب عالمگیر اورنگ زیب اپنے باپ شاہجہاں سے قطعی بدگمان ہو کر قلعہ کو ملازمین شاہجہانی سے خالی کرا چکا ہے۔ اور عملاً وفعلاً شاہی اس کے حضور میں پہنچ چکا ہے لیکن ابھی تک وہ اپنے بھائی سلطان مراد بخش کو بظاہر بادشاہ بنائے ہوئے خود اس کی جانب سے کام کر رہا ہے اس صورت میں جو اس نے پہلا دربار آگرہ میں کیا ہے اس کے متعلق بحوالہ عاقل خاں، عالمگیر نامہ، عمل صالح اور سیر المتاخرین تحریر کیا ہے۔

"اب اس نے ایک نہایت شاندار دربار عامہ (مگر شاہزادوں کے دستور کے موافق بہ نشست مسند) منعقد کر کے سب امراؤ منصب داروں کی نذریں (شاہانہ طور پر) لیں"

اب کہنے والا کہے گا کہ جب کرسیوں پر بیٹھنے کا دستور نہ تھا تو دربار شاہی میں کرسیاں جابجا لگائی کیوں جاتی تھیں؟ اصل یہ ہے کہ ان چوکیوں، صندلیوں اور کرسیوں پر ''قور خاصہ (جواہر طراز اسلحۂ شاہی) نوادر و نفائس عالم، بیش قیمت نقرئی و طلائی ظروف اور اگردان وغیرہ چنے جاتے تھے۔ چنانچہ صاحب جہاں آرا نے جشن حصول صحت مسطور الصدر کے سلسلہ میں آراستگی و پیراستگی دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''زرین کرسیوں پر جابجا مشک و از فرجلتا تھا'' اور صاحب سیر المتاخرین نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے جلوس ثانی کی آرائش و زیبائش دربار کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی تحریر کیا ہے ''عقب تخت صندلی ہائے طلا نہادند و قور خاصہ را کہ مشتمل است بر شمشیر ہائے مرصع ساز و پر دلہائے جواہر طراز و سپر ہا و بر چھاہائے مرصع کار جواہر نگار کہ ترصیع آں انواع جواہر ثمینۂ گراں بہا بکار رفتہ بر روئے صندلی ہا گزاشتند ....در ایوانہا اوانے طلا و ظروف نقرہ کہ از لوازم آرائش ایں قسم بزمہائے دولت آئین است بر کرسی ہائے زرین و سیمین چیدہ شدہ''

متبعین تہذیب حاضرہ کرسیوں پر چیزوں کے چنے اور سجائے جانے کا مضحکہ اڑانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن نہیں اسلاف کے مراسم کو ہمیں نگاہ ادب آمیز سے دیکھنا چاہیے۔ جس طرح ہر ملکے و ہر رسے مشہور ہے۔ اسی طرح ہر عہدے و ہر رسے مسلم زمانہ و تہذیب زمانہ ہر روز تغیر میں ہے کیا عجب کہ ہمارے مستقبل میں ہماری طور و طریق قابل مضحکہ سمجھے جائیں۔

اس زمانہ میں خود کرسیاں عجائبات میں شمار ہوتی تھیں۔ اور حق یہ ہے کہ خوب خوب بنتی تھیں۔ پس اگر ان سے یہ کام لیا جاتا تھا تو کیا برائی تھی۔ اور جگہوں کا تو حال مجھے معلوم نہیں۔ البتہ آگرہ میں میں نے عشرہ اولے محرم الحرام میں دیکھا ہے کہ ورزشی اور کرتبی اکھاڑوں کے مرکزوں میں خنجر، بچھوا، تلوار، سیف اور کرتب اور ورزش کے دوسرے سامان و آلات کرسیوں اور چوکیوں ہی پر چنے رہتے ہیں۔ جو گویا کہ سلاطین مغلیہ کے آئین دیرینہ کی یادگار ہے۔

یہاں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہمارے یہاں کے صرف مترجمین و مصنفین بلکہ جامعین لغات کو بھی ''صندلی'' اور ''کرسی'' کے مفہوم میں بہت کچھ اشتباہ ہوا ہے چنانچہ صاحبان غیاث، برہان و منتخب دونوں کو ہم معنی بمعنی ''تخت کوچک (چوکی)'' لکھتے ہیں۔ صاحب منتخب و صاحب برہان نے ''سندلی'' بالسین لکھا ہے اور محمد عبد الواحد صاحب مرحوم مہتمم مطبع مصطفائی دہلی ''کلمات طیبات عالمگیری المعروف بہ رقعات عالمگیری'' نے

حواشی کتاب مسطور الصدر میں ''صندلی'' کی اصل بلا تذکرۂ توجیہ''' سنگدلی'' تحریر کی ہے۔ مگر صاحبان برہان و نفائس کے بیان کے موافق ''صندل'' چندل'' کا معرب ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم بانصاد لکھنے والوں کا اتباع کریں۔ رہے معنی میری رائے میں ''صندلی'' سے حسب بیان صاحب برہان اور جامع رائل ڈکشنری اسٹول اور چھوٹی سی چوکی) جس پر لالٹین، لیمپ یا جوتا اور کھڑاوں وغیرہ رکھتے ہیں، سمجھنا چاہیے اور اسٹول کے خیال کے ساتھ ہی ساتھ اگر ہم چھوٹی سی تپائی اور آرائشی میز بھی اس کا مفہوم سمجھیں تو کوئی مضائقہ نہیں کرسی کا مفہوم میری نظر میں ماضی وحال میں یکساں ہے۔ اس تصریح کے بعد اب کوئی دقت نہیں رہتی۔ اور قرین قیاس یہ امر طے ہوتا ہے کہ صندلیاں مشک واگر وغیرہ جلانے، گلدان قیمتی ظروف اور عجائبات عالم ونوادر روزگار اشیا کے سجانے کے کام میں آتی ہوں گی اور کرسیاں بوجہ تکیہ دار ہونے کے اسلحہ وغیرہ آراستہ کرنے کے کام میں مگر اشتباہ معنوی نے ایک خاص مغالطہ میں ڈال دیا۔ یہ بیان کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ 'صندلی' زمانہ پیشینہ میں صندل کی لکڑی سے بنائی جاتی ہوگی۔ اسی بنا پر اس نام سے موسوم ہوئی کہ عیاں راچہ بیاں۔ 21

نوٹ نمبر 6۔ یہ فعل بھی خالی از تدبر و رعایا نوازی نہ تھا۔ گویا جتلانا مقصود تھا کہ اگر ترک دست راست اور افغانی دست چپ سلطنت، ہیں تو راجپوت قلب دولت۔ 21

نوٹ نمبر 7۔ علامہ سعد اللہ خان۔ چنیوٹ علاقہ جھنگ (پنجاب) کے رہنے والے اور ایک غریب گمنام کے بیٹے تھے۔ لاہور میں تحصیل علم کی اور فقط علم کی برکت نے اس مرتبہ تک پہنچایا کہ شہنشاہ ہند کے وزیر اعظم ہو گئے۔ 1050ھ میں ملازم ہو کر 1055ھ میں دیوان خالصہ اور 1057ھ میں وزیر اعظم ہوئے۔ ان کی بنائی ہوئی مسجد چنیوٹ میں اب تک موجود ہے۔ جس کے دو مینار سنگ لرزاں کے ہیں جو ہلانے سے حرکت کرتے ہیں۔ 12

نوٹ نمبر 8۔ فرعون۔ معرب ہے۔ مصری زبان کے لفظ ''فر phra یا pra) سے اس کو فرانسیسی میں "pharaoh"۔ یونانی میں "pharoo" عبرانی میں Paraoh اور انگریزی میں Pharaoh کہتے ہیں مصری زبان کے لفظ ''فر'' کے معنی ''آفتاب'' کے ہیں۔ یہ مصر قدیم کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ (از انسائیکلو پیڈک ڈکشنری جلد سوم و پنجم مطبوعہ کیسل کمپنی)

عربوں کا مقولہ ہے کہ مصر کے اٹھارھویں حکمران خاندان کے بادشاہوں نے سب سے پہلے اس

لقب کواختیار کیا۔

تمام انجیل میں دس فراعنہ کا ذکر ہے۔

(1) وہ فرعون جو بحر قلزم میں غرقاب ہوا تھا۔

اور غالبًا یہ وہی ہے جو موسیٰؑ کے عہد میں تھا۔ اور جس کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے اس کا نام مینوفتش (Menopthes) بن ریمزلیس دوم Ramses)II) بتایا جاتا ہے۔

(2) وہ فرعون جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں تھا (کتاب پیدائش باب 12۔آیۃ 25)

(3) فرعون نیک کردار جس نے حضرت یوسفؑ کی اعانت کی تھی (کتاب پیدائش باب 12)

(4) وہ فرعون جس نے خدادکو بچایا تھا (کتاب سلاطین 1-باب 11-آیۃ 19)

(5) وہ فرعون جس کی لڑکی کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کی شادی ہوئی تھی (کتاب سلاطین 1-3-1 باب 9۔آیۃ 16)

(6) فرعون شیشک جس نے ری ہو بوم (Rehoboom) کے ساتھ جنگ کی تھی (کتاب سلاطین 1-باب 14-آیت-16)

(7) وہ فرعون جس نے ہیزکیاؔ کے ساتھ سنخرب کے مقابلہ میں عہد نامہ کیا تھا۔

(8) فرعون نیکو جس نے یوشع کے ساتھ جنگ کی تھی (2-کتاب سلاطین باب 23 آیت 19 وغیرہ)

(9) فرعون ہوفرا جو زدیکیا کا اتحادی تھا۔ (کتاب ری باب 44-آیت 30) کہا جاتا ہے کہ اس کا نام (Afries) تھا اور اس کو 570 قبل مسیح میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا (کتاب سلاطین) منقول از ڈکشنری فریز اینڈ فیبل، یہاں متن میں اول الذکر فرعون مراد ہے۔ جس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ 21

شاہجہاں کے عہد میں دولت مغلیہ کا وقار

اور

بادشاہ کی سلیم الطبعی

جس وقت شاہجہاں نے عنان حکومت ہاتھ میں لی ہے دولت چغتائیہ کے مہر اقبال کا عروج قریب قریب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا، رعب و دبدبہ اور جاہ و اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ ایک

خفیف سی چشم نمائی کے بعد وردست ریاستوں کا سر نیاز خم کر دینا ایک معمولی سی بات ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ کانیں اور برآوردگی جواہرات کی جو سہولتیں اور آسانیاں شاہجہاں کو نصیب ہوئیں اور بادشاہوں کو میسر نہ آئیں۔ گو ایشیا و یورپ کے سفرا اور سیاحوں سے اس کا دربار کھچا کھچ بھرا رہتا تھا اور بڑے بڑے راجپوت سورما، کسی کی اطاعت نہ کرنے والے بہادر ترک و افغان تاج گورگانیہ کے آگے سر اطاعت و انقیاد خم کیے بیک اشارۂ چشم دہکتی ہوئی آگ اور بہتے ہوئے ذخار دریاؤں میں پھاند پڑنے، رستم 1 و اسفند یار 2 صفت ہستیوں سے ہم نبرد ہو جانے اور ہمت شکن و دشوار گزار قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے ہر وقت آمادہ و مستعد نظر آتے تھے۔ مگر یہ شاہجہانی سلیم الطبعی تھی کہ بجائے خونریزی اور توسیع سلطنت کے اس نے اندرونی انتظامات اور ملکی ترقی کو مدنظر رکھنا بہتر خیال کیا۔

بے شمار دولت اور لاانتہا جواہرات سے ایک تو پہلے ہی سے خزائن پُر تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس فیروز بخت بادشاہ کے تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہی کوہ و دریا نے حاصل کان و بحر کو قدوم میمنت لزوم پر اور لا لا کر نچھاور کرنا شروع کر دیا تھا۔ بنابریں نفاست پسند شاہجہاں نے جو کہ اکبری جلال اور جہانگیری شوکت و اجلال کے شاندار مناظر کی سیر میں اپنی عمر کی چھتیس منزلیں طے کر چکا تھا۔ علم و فن کی سرپرستی، دربار اور ساز و سامان دربار کی آراستگی و پیراستگی (کہ یہ بھی صنعت و حرفت کی تربیت تھی) شروع کر دی۔ لہٰذا سب سے پہلے وہ اورنگ سلطنت (تخت طاؤس) کے بنوانے پر آمادہ ہوا کہ بادشاہ کی ابتدائی اور انتہائی شان تاج و تخت پر ہی منحصر ہے۔ ادھر کروڑھا روپے کے جواہرات جو خزانوں اور جواہر خانوں میں قدیم راجاؤں اور پٹھانوں کی لوٹ مار، شاہان ممالک خارجہ کے تحفہ و ہدایا، امراؤ شاہزادگان کے نذرانوں کے سلسلہ میں جمع ہو گئے تھے اور بیکار پڑے تھے۔ ان سے زیب و زینت کے سوا دوسرا کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور مذاق زمانہ کے مطابق اگر صحیح مصرف ہو سکتا تھا تو صرف یہ کہ یہ ایک ایسی شکل میں منتقل کیے جائیں کہ خاص و عوام کو ان کی سیر کا موقع مل جائے سلطنت کے وقار اور ساتھ ہی ملکی دستکاری و کاریگری میں نمایاں ترقی ہو جائے۔

نوٹ نمبر 1۔ رستم۔ فارس کے مشہور پہلوان کا نام ہے۔ یہ نام فارسی ادب میں بکثرت آیا ہے۔

شاہ نامہ فردوسی اس کے کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں اس کو رستم داستان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کو رستم زابلی بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ زابلستان کا حاکم بھی تھا اس کے باپ کا نام زال کہا جاتا ہے اور دادا کا نام نریمان تھا۔ بہمن کے مقابلے میں جو خاندان کیانی کا ساتواں بادشاہ تھا مارا گیا۔

رستم کے متعلق ایشائی قدیم شاعرانہ طرز یعنی مبالغہ گوئی سے بہت کام لیا گیا ہے۔ خود اس کا ممدوح فردوسی کہتا ہے۔

منش کردہ ام رستم پہلوان وگرنہ یلے بود در سیستان

(ماخوذ از قاموس المشاہیر اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری، شعر العجم)-12

نوٹ نمبر 2- اسفندیار۔ بن گشتاسپ شاہ فارس کا سپہ سالار تھا۔ جس کو رستم نے قتل کیا تھا۔ اس کا تذکرہ شاہنامہ فردوسی میں ہے (قاموس المشاہیر)

دولت اور اس کا مصرف

تخت طاؤس کی ساخت کے متعلق ہم کو شاہجہاں کا مطمح نظر اور اس کی مصالح مملکت سمجھنے کے لیے امور ذیل کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے یعنی یہ کہ دولت کا مصرف، اس کے اقسام اور ان کے طریق حصول، جو امور کہ ہمارے سلسلہ بیان میں آتے ہیں انھیں ہم سپرد قلم اور بقیہ مسائل کو نظرانداز کردیں گے۔

دولت کیا ہے؟ اس کا جواب ایک فقرے میں نہیں دیا جا سکتا۔ اشخاص، حالات، ازمنہ، ماحول یا ان سبھوں کی مجموعی کیفیت سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں اور مختلف اجناس کی قدر و قیمت کا اندازہ جس طرح کیا جاتا ہے اسی کا نام ''دولت'' ہے۔

دنیا کی حالت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم کو کہیں معاون نظر آتے ہیں اور ان کا نام ''دولت'' قرار پاتا ہے۔ کہیں نفت کے چشمے اپنے فوائد انسان کے پیش نگاہ کر کے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ کہیں لکڑیوں کے جنگل معیار دولت قرار پاتے ہیں کسی مقام پر آبی رو کے اِنحِکاک سے جو انقلاب ہیئت ہوتا ہے اور اس سے جو برقی قوت انسان کے قبضۂ قدرت میں آتی ہے اور اس طرح بطنِ ارض سے اس کے مکتوم خزائن کا نکالنا اس کے لیے سہل ہو جاتا ہے

دولت کہلاتی ہے۔ کہیں عَنۡبَرِ الۡلّوُن خطبِ مُتَحَجِّر اپنی گوناگوں قوتوں کی وجہ سے ساری دنیا کے ذخائر کو اپنے مقام پر جذب کر کے سرمایۂ دولت بنتا ہے۔ اسی طرح ریشم اور اشجار گوناگوں و ازہارِ بوقلموں کے متعلق جتنی چیزیں ہیں اپنی اپنی جگہ سب دولت کے لقب سے ملقب ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان سب سے علاحدہ محض انسانی صنعت و دستکاری ذریعہ کسب مال وحصول معیشت یعنی ''دولت'' کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔

ان مدارج کے طے ہونے کے بعد یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں نہایت آسانی سے آجاتا ہے کہ ایک ہی چیز جو ایک وقت میں ایک مقام پر ایک شخص کے لیے مخصوص ماحول میں خواہ وہ کتنی ہی قلیل المقدار و دنی المقدرت کیوں نہ ہو مگر ممکن ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قدر و قیمت کی شے قرار پا جائے مثلاً ایک تشنہ کام جاں بلب کے لیے ایک قطرۂ آب۔ اسی طرح سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی گراں بہا چیزیں یکساں طریقے سے ہر شخص کے لیے قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ ایک لعل شب تاب ایک والی ملک کے جواہر طرف کلہ کے ساتھ اوج قسمت لعل و گہر کا معیار قرار پاسکتا ہے مگر گدڑی کا لعل ہو کر بے قدر رہ جاتا ہے۔ اسی سے ہم دنیا کی تمام چیزوں کی حالت کا اندازہ لگا سکتے اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اور اس قدر و قیمت کی نوعیت ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اسی حیثیت کے ساتھ اس کے صحیح مصرف کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اگر جواہرات کی مکلف تھیلیاں توشہ خانہ کے کسی گوشہ میں صندوقچوں میں پوشیدہ رہیں اور موقع بہ موقع نظارگیاں عالم کو محو دید کر کے سلطانی ہیبت و جبروت کا ایک ناپائدار اثر پیدا کریں تو ان کا یہ مصرف ہرگز اس قدر صحیح نہیں ہوسکتا ہے جس قدر کہ یہ طریقۂ استعمال کہ ان کو حسن و خوبی سے مرتب کر کے ہیبت و دبدبۂ سلطانی، شان وشکوہ و آرائی عظمت و جلالت جہانداری کی جیتی جاگتی تصویر قرار دے کر اُن سے روزانہ ایک مستقل و پائدار اثر سلطانی نہیب و دبدبہ کا پیدا کیا جائے۔

سلاطین عالم کا مذاق

سلاطین عالم رعایا و برایا پر اپنا رعب قائم کرنے کے لیے ہمیشہ سے مختلف طریقے کام میں لاتے رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً فوجوں کے متحرک ہونے، عجیب وغریب عمارتوں کے قیام اور

دربار کے مختلف طریقوں سے آراستگی و پیراستگی وغیرہ وغیرہ کا مقصد سطوت سلطانی کے ساتھ ساتھ جبروت وقہرمانی پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ حتیٰ کہ سفرائے دول جو ممالک خارجہ میں جاتے ہیں تو اپنے سفارتخانوں تک کو ابتر حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ مثلاً لارڈ کرزن 1 آنجہانی نے اپنے زمانہ سفارت ایران میں دولت برطانیہ کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ برطانی سفارتخانہ شایان شان سلطنت نہیں۔ اس سطوت و اقتدار قائم کرنے کے ساتھ ہی دول کو ہمیشہ شہرت دوام حاصل کرنے کا خیال بھی رہا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں بگ بین (Big Ben) نامی گھڑی اور ممالک متحدہ امریکہ کی اکثر عمارتیں اسی خیال کا ایک مجسم نمونہ ہیں۔ اس لیے کسی بادشاہ وقت کو یہ خیال پیدا ہو کہ خزانہ عامرہ میں بیش بہا جواہرات کے بیکار پڑے ہوئے خزینہ کو پیکر رعب سلطانی کی شکل میں منتقل کیا جائے، ایک امر عجیب نہیں۔ تخت طاؤس اسی خیال کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

لوٹ نمبر 1۔ لارڈ کرزن (دیکھو صفحہ 141 کا حاشیہ 1)

تخت طاؤس کی فرمائش

شاہجہاں نے 1038ھ/1628=1 جلوس میں اس اُعجوبۂ روزگار اور نادر زمانہ تخت کی تیاری کا حکم دیتے ہوئے باستثنائے جواہر خاصہ (قیمتی دو کروڑ روپیہ) کہ محل معلیٰ میں محفوظ تھے، تمام ان جواہرات کے پیش کرنے کا فرمان صادر کیا 1 جو ''بیرونی خزانچیوں'' کی تحویل میں رہتے تھے۔

لوٹ نمبر 1: ماثر الامرا، حواشی سفرنامہ۔ بر نیر نوشتہ خلیفہ محمد حسین صاحب بحوالہ ملا عبدالحمید لاہوری)

ایک تاریخی مغالطہ کا ازالہ

لفظ ''بیرونی خزانچی'' میں نے لکھا ہے۔ جو بظاہر صاحب ''ظفرنامۂ شاہجہاں'' 1 کے بیان کے خلاف ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں:۔

بادشاہ نے حکم دیا جواہر خاصہ کے سوا جو جواہر خانۂ محل معلیٰ میں از قسم لعل، یاقوت، الماس، مروارید زبرجد قیمتی دو کروڑ روپے کے ہیں اور جواہر کہ ''خان زمان'' کی تحویل سے باہر ہیں۔ ہمارے سامنے لائے جائیں۔''

اس عبارت سے ایک تاریخی مغالطہ ہوتا ہے کہ خان زمان کسی داروغۂ جواہر خانہ یا خزانچی کا نام یا خطاب ہے اور اس کی تحویل میں رہنے والے جواہرات کو بھی بادشاہ نے پیشی سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ کیونکہ میری ذاتی تحقیقات کے مطابق سلاطین تیموریہ ہند کے عہد میں جتنے امرا یا ملازمین شاہی اس نام کے گزرے ہیں۔ یا جو اس خطاب سے مخاطب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی خزینہ داری کی خدمت یا داروغۂ جواہر خانہ کے عہدے پر کبھی مامور نہیں ہوا۔ حتٰی کہ کسی انتظام کے سلسلہ میں بھی کسی ایک سے عارضی طور پر یہ خدمت کبھی نہیں لی گئی۔ خود شاہجہاں کے زمانۂ فرمانروائی میں میر خلیل برادر جعفر خان داماد نواب آصف خان وزیر اعظم اور امان اللہ خان امانی بن مہابت خاں یہ دو امرا اس خطاب سے مخاطب ہوئے۔ مگر ان کے حالات و سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی اس قسم کی خدمات انجام نہیں دیں 2۔ اس کے علاوہ ملا عبدالحمید لاہوری، مورخ شاہجہانی ''بادشاہ نامہ'' میں لکھتے ہیں

حکم شد کہ سوائے جواہر خاصہ کے در جواہر خانۂ مشکوے مینو مثال می باشد...... کہ دو صد لک روپیہ قیمت آنست ہر چہ در تحویل خازنان بیرونست از نظر اطہر بگزرانند

جس سے میرے بیان کی تائید ہوتی ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ ظفر نامہ میں بجائے ''خازنان'' کے ''خان زمان'' استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل مصنف علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا ہوگا۔

''..................اور جواہر کہ خازنان کی تحویل میں باہر ہیں..................''

لیکن کاتب صاحب کی عنایت اور مصحح کی مراعاۃ نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سلاطین چغتائیہ کے عہد میں خود ان کے اور ان کے امرا کے یہاں بھی ہر کام اور ہر ضرورت کے لیے ایک جداگانہ منظم شعبہ قائم تھا۔ مثلاً توشہ خانہ، آبدار خانہ، باورچی خانہ اور زرگر خانہ وغیرہ اور ہر شعبہ ایک خوش سلیقہ داروغہ (مہتمم) کے زیر اہتمام رہتا تھا ان میں سے اکثر شعبے ''کارخانہ'' کے نام سے موسوم تھے اور مجموعی طور پر یہ تمام شعبہ جات ''کارنجات'' کہلاتے تھے چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے بیٹے محمد 4 اعظم المخاطب بہ عالی جاہ کو ایک خط میں لکھا ہے۔

ما کہ پان نمی خوریم ایں کارخانہ ہم رنگے دیگر گرفت و آبدار خانہ ہم بآب وتاب نیست۔ہوشیاری وجزرسی داروغہا آنست کہ ہمہ وقت ہمہ جا کارخانجات عہدۂ خود بہ تزک آراستہ دارند تا وقت کار مجرائے آنہا ظاہر شود و نفاست مزاج و پاکیزگی آنہا بر ماہویدا گردد و ہمہ مردم بینند گان شان دولت خداداد ما معلوم کنند و شکوہ او معائنہ نمودہ ناتوان بیناں پست گردند5۔

مولانا مولوی محمد حسین6صاحب آزاد دہلوی نے بھی دربار اکبری میں ''سفر میں بارگاہ کا کیا نقشہ تھا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔

''..........پھر ذرا بڑھ کر توشہ خانہ، آبدار خانہ، خوشبوخانہ وغیرہ تمام کارخانے ہر گوشہ پر حوک.............................. یہاں ''خازنان بیروں'' سے ''زرگرخانہ'' کے منتظمین، کارکن اور تحویل دار مراد ہیں جن کا بیرونِ محل ہونا لازم جیسا کہ صاحب7ماثر الامرا کے بیان سے واضح ہوتا ہے موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

''سوائے جواہر خاصہ کہ اندرون محل می باشد (ودو کروڑ روپیہ قیمت آنست) از جواہر یکہ در کارخانہ (مراد گارخانہ زرگاری۔کشتہ قادری) بود و قریب سہ کرور روپیہ از یں جملہ بہ بہائے مبلغ ہشتادوشش لک روپیہ انتخاب نمودہ......''

نوٹ نمبر 1–صاحب ظفر نامہ شاجہاں مراد از شمس العلما، خان بہادر مولوی ذکاءاللہ خاں بن حافظ ثناءاللہ یہ یکم اپریل 1832 کو دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔بعد فراغ تعلیم اسی کالج کے مدرس ریاضیات مقرر ہوگئے، بعدۂ آگرہ کالج میں ادب اردو کی تعلیم پر مامور ہوئے 1885 میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی آسامی پر مقرر ہوکر اضلاع بلند شہر اور مرادآباد میں رہے۔1866 میں دہلی نارمل اسکول کی صدر مدرسی اختیار کرلی1869 میں ''اورینٹل کالج'' لاہور میں لیکچراری کی خدمت پیش کی گئی۔لیکن اس ملازمت پر جانے سے پہلے آپ میور کالج الہ آباد کے پروفیسر مقرر کردیے گئے۔اور ایم۔اے تک عربی فارسی پڑھاتے رہے اسی کالج سے پنشن لے کر خانہ نشین ہوگئے۔ اور 24 سال تک تصنیف وتالیف میں اپنا وقت صرف کیا۔آپ کی تصنیفات وتالیفات کی جامع فہرست ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔جو یہ ہے

مضمون	کتب مطبوعہ	غیر مطبوعہ	کل
ریاضیات	81	6	87
تاریخ وجغرافیہ	17	1	18
ادب	16	0	16
اخلاق	6	0	6
طبیعات وہیئت	7	2	9
سیاست ومدن	2	5	7
میزان	129	14	143

یہ 143 کتابیں 1854 سے 1910 تک کی کمائی ہیں۔ امام غزالی کا روزانہ اوسط تصانیف 4 صفحہ ہوتا ہے۔ اور یہی اوسط قریب قریب مولانا ذکاء اللہ صاحب کا ہے۔ آپ نے 7/ نومبر 1910 کو بمقام دہلی انتقال کیا۔ مختلف اصناف میں آپ کے زور قلم نے ایک حد تک اردو کی ضرب المثل مفلسی کو دور کیا۔ آپ اراکین خمسہ اردو (نذیر احمد۔ ذکاء اللہ۔ سرسید۔ شبلی وحالی) میں سے ہیں۔ آپ نے یوں تو تاریخ، فلسفہ، سائنس کیمیا، طرز معاشرت، علم المعشیت اور سیاسیات وغیرہ جملہ مضامین پر خامہ فرسائی فرمائی لیکن فلسفہ ریاضی اور تاریخ سے آپ کو ایک خاص دلچسپی تھی۔ ترجمہ کاری کے آپ استاد تھے اور انگریزی میں جس کو از خود شوقیہ پڑھا تھا اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ بہت سی انگریزی کتابوں کا آپ نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے طرز بیان میں یہ خوبی ہے کہ ترجمہ ترجمہ اور مضمون ماخوذ ماخوذ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ان کا ذاتی خیال نظر آتا ہے۔

آپ کی "تاریخ ہندوستان" کے اٹھارہ حصے تیرہ جلدوں میں مجلد اور سات ہزار ایک سو نہتر صفحات پر مشتمل ہیں۔ ہر جلد ایک جداگانہ نام سے موسوم ہے۔ "شاہجہاں کے واقعات جس جلد میں مرقوم ہیں "ظفر نامۂ شاہجہاں" کے نام سے معروف ہے۔

آپ کی تاریخوں کے متعلق پنڈت برج نرائن چکبست کا قول ہے۔ ان کی تاریخوں میں اس نقادانہ لیاقت سے کام نہیں لیا گیا ہے جو کہ فن تاریخ کی شان میں داخل ہے مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہیں۔" یہ قطعی صحیح ہے کہ انھوں نے جس کی طرف داری پر کمر باندھی اپنی تاریخوں میں اصلی رنگ ظاہر نہ کرتے ہوئے ملمع سازی

سے کام لیا۔ جو ایک مورخ کی شان کے خلاف ہے (ماخوذ سیر المصنفین تنہائی۔ اے اور گلدستہ ادب مولفہ منوہر لال زتشی ایم اے)

نوٹ نمبر 2۔ قاموس المشاہیر۔

نوٹ نمبر 3۔ ملا عبد الحمید لاہوری۔ شاہجہاں کا مورخ خاص تھا۔ اس نے بست سالہ حالات شاہجہاں قلم بند کیے ہیں جو ''بادشاہ نامہ'' کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ تاریخ شاہجہان کے عہد سلطنت کی بیس سال کی معتبر تاریخ ہے اور چھپ چکی ہے۔ ملائے موصوف نے 1064ھ/20ج شاہجہانی میں انتقال کیا۔ (آب حیات وقائع سیاحت برنیر)12

نوٹ نمبر 4۔ محمد اعظم شاہ نام، عالی جاہ خطاب، اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا تھا۔ جو 25 شعبان 1063ھ = 11 جولائی 1653 کو دلرس بانو بیگم الخاطب بہ شاہ بانو بیگم بنت شاہنواز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت چونکہ اس کا بڑا بیٹا محمد معظم شاہ الخاطب بہ بہادر شاہ گجرات میں تھا۔ لہٰذا یہ 10 ذی الحجہ 1118ھ/ 1707 میں بادشاہ بنایا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد دونوں بھائیوں میں کشمکش پیدا ہوگئی اور نوبت تا بہ جدال وقتال پہنچی۔ اور یہ بروز یک شنبہ 18 ربیع الاول 1119ھ = 8 جون 1707 کو اورنگ زیب کی وفات کے 13 ماہ 18 دن بعد بمقام جاجئو (مابین آگرہ اور دھولپور) نہایت بہادری کے ساتھ اپنے بھائی کے خلاف لڑ کر اپنے دو بیٹوں بیدار بخت و والا تبار سمیت برسر میدان مارا گیا اور مقبرہ ہمایوں دہلی میں دفن ہوا۔ عالی تبار اور بیدار دل دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ اورنگ زیب اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اکثر اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ یہ شاہزادہ حافظ قرآن، علوم ادبیہ سے بہرہ یاب، ترکی و فارسی زبان کا ماہر اور اقسام انشا پردازی پر حاوی اور بے حد بہادر تھا۔ اورنگ زیب نے جو تقسیم نامۂ مملکت بیٹوں کے نام لکھا تھا اس پر اس کے بیٹے رضامند نہ ہوئے اور آپس میں ٹکرا گئے۔ نتیجہ عالی جاہ کی موت اور بہادر شاہ کی بادشاہت ہوا۔

(تاریخ ہند مولوی ذکاءاللہ اور ینٹل بیل اور قاموس المشاہیر)۔12

نوٹ نمبر 5۔ کلمات طیبات المعروف بہ رقعات عالمگیری = 12

نوٹ نمبر 6۔شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی۔بن مولوی محمد باقر جنھوں نے "اردو اخبار" کے نام سے پہلا اخبار 1856 میں دلی سے نکالا۔شرفائے دہلی سے تھے۔آزاد باختلاف مورخین 1831 یا 1832 یا 1833 میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم حضرت ذوق دہلوی کے سایۂ عاطفت میں پاکر دہلی کالج میں داخل ہوئے اور علوم مروجہ میں اچھی استعداد پیدا کی۔ذوق کی بدولت اکثر نامی گرامی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ان کی وفات کے بعد حکیم آغا جان عیش سے استفادہ کیا۔ہنگامۂ غدر 1857 میں اپنے باپ کے شہادت پانے کے بعد اودھ کی طرف بھاگے۔اور ایک مدت تک صحرا نوردی کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور وہاں دفتر سررشتۂ تعلیم میں ماسٹر پیارے لال آشوب (مربی اردو) کی سفارش سے ملازم ہوگئے۔ماسٹر صاحب کی سفارشیں خود ان کی علمی قابلیتیں اور میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات پنجاب کی قدر دانیاں ان کی ترقیوں کا باعث ہوئیں۔اور یہ "سرکار اخبار" کے معین مدیر اور یونیورسٹی کالج کے پروفیسر بنادیے گئے۔حکومت پنجاب کے میر منشی پنڈت من پھول آنجہانی کے ساتھ 67-1866 میں آپ نے کابل بدخشاں کا سفر کیا۔اور 1886 میں ایران گئے۔ان کو سرکاری خدمات کے صلہ میں عـہ روپیہ پنشن ملتی تھی۔مگر اپنی تصانیف کی بدولت انھوں نے خاصہ سرمایہ جمع کرلیا تھا۔ان کا کتب خانہ قابل قدر تھا۔جس کی عمارت انھوں نے اپنے حین حیات میں بنوائی تھی۔اگست 1889 میں آثار جنون پیدا ہوئے اور 1910 میں اسی عالم میں 21 سال بسر کرکے بمقام لاہور راہی ملک بقا ہوئے۔مولانا مرحوم نے جو کچھ شہرت حاصل کی اپنے علمی کارناموں کی بدولت اور جو عزت پیدا کی اپنے قوت بازو کے بھروسے پر۔وہ فلک اردو کے آفتاب ہیں۔اردو زبان پر ان کے احسانات عظیم ہیں۔انھوں نے اردو کا ایک بہترین سلسلہ ادب وقواعد لکھ کر نہ صرف اہل پنجاب کو اردو کی سلیم المذاقی کا درس دیا بلکہ باشندگان ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے لیے ادبی صراط مستقیم قائم کرگئے۔ان کی جدت طبعی نے اردو کی شاعری قدیم کی کساد بازاری السنۂ مغربیہ کی روز افزوں ترقی کے وجوہات پر نظر ڈال کر اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی اور اس پر بہترین وقابل تقلید عمارتیں تعمیر کیں جو تاریخ اردو کا جزو لاینفک ہیں۔

آزاد کی سب سے بڑی شہرت کا باعث ان کے کارنامہ ہائے نثر ہیں اور ان کا طرز تحریر ثنا وصفت سے مستغنی ہے۔بیان کی لطافت، زبان کی سلاست، بندش کی چستی، محاورے کی دلآویزی جس قدر اور جس اسلوب سے آزاد کے یہاں ہے کسی دوسرے نثار اردو کے یہاں نہیں اور ظرافت کی چاشنی ان سب پر طرہ ہے۔بقول منشی

بالمکند صاحب گپت ان کا ایک مخصوص امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ جس قلم سے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر علما وفضلا کو محوِ حیرت بنا سکتے ہیں۔ اسی قلم سے پہیلیاں اور لوریاں لکھ کر بچوں کو بہلا سکتے ہیں۔ اور یہ ایسا وصف ہے جو دنیا کے بہت ہی کم مصنفین کے حصہ میں آیا ہے ان کا مذاق سلیم ایجاد و اختراع کے ہر موقع پر بتلا دیتا ہے کہ کون سی اختراع قابل پذیرائی ہے اور کون سی ایجاد مزاج زبان کے خلاف اور یہ وہ نکتہ ہے جس کو نئی روشنی کے دلدادہ مغربی ادب کی تقلید کی دھن میں اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں اور جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ثقل الفاظ وگرانباری تراکیب کے باعث زبان اصلی لطافت کو کھو بیٹھتی ہے اور اہل زبان کو ایک تلخوش مرکب سے دوچار ہو کر ترقی زبان سے مایوسی ہو جاتی ہے۔

یوں تو مولانا کی تصنیفات و تالیفات بے شمار ہیں۔ مگر آب حیات، نیرنگ خیال، سخندان فارس اور دربار اکبری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نیرنگ خیال:۔ جہاں اخلاق وتمدنی اصلاح کا دستور العمل اور پند ونصائح کا ایک دفتر ہے وہاں رنگین بیانی کا دلفریب مرقع۔ استعارے وتمثیل کے پردے میں وہ وہ جوہر نمایاں کیے ہیں کہ باید وشاید اور پھر اپنی روش خاص کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آمد کا دریا ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ یہ کتاب انگریزی روش الیگوریکل (نثر تمثیلی) کا اردو میں شاہکار اور اہل نظر کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

سخندان فارس:۔ علم فلسفۃ السان کی اردو میں پہلی کتاب، مولانا کے طرز بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس میں فارسی وسنسکرت کے رشتے کھولے ہیں۔

مولانا نے اردو میں تذکرہ نویسی اور خصوصاً تاریخ نگاری کی ایک نئی وضع قائم کی یعنی تاریخ نویسی کی روش قدیم کو ترک کر کے (کہ وہ صرف واقعات کی فہرستیں ہوتی تھیں) سوسائٹی کا رنگ بھی دکھلایا ہے اور اردو کے لیے تاریخ نگاری کا ایک مکمل نمونہ چھوڑ گئے لیکن ان کی تاریخی کتابیں دنیا بھر کی خوبیوں کے ساتھ ایک خاص عیب بھی لیے ہوئے ہیں وہ یہ کہ ان کا قلم جنبہ داری کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ جیسا کہ دہلوی ہونے کے باعث انھوں نے ''آب حیات'' میں کہ باعث احیائے قدما وقدامت اور اپنی طرز کا تذکرۂ فرد ہے۔ لکھنؤ کے بعض باکمال اور لازمی طور پر قابل ذکر شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے وہ جا بجا اپنی آرا اور اپنے جذبات کو نمایاں کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے جس کا مظہر ان کی بہترین تصنیف دربار اکبری ہے اور یہ امور اصول فن تاریخ نویسی کے خلاف ہیں۔ لیکن

مولانا مرحوم انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے کہ معصوم ہوتے۔ مورخین اکثر اس دام میں پھنس ہی جاتے ہیں۔ گو دربار اکبری پیرانہ سالی اور ایسی حالت میں لکھی گئی ہے کہ وہ بعض امراض میں مبتلا تھے اور ان کی دماغی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تاہم کتاب دلاویز اور ''آزادیت'' کا نمونہ اعلیٰ ہے۔ ان کے طرز تاریخ نویسی کو لارڈ میکالے کی روش تاریخ نگاری سے مانا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جس قدر اس کی انگریزی پرلطف ہوتی ہے اسی قدر ان کی اردو اور جیسی اس کی تاریخ انگلستان ساقط الاعتبار ہے ایک حد تک ویسی ہی ان کی دربار اکبری۔

وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔ مگر بہت سے مواقع پر اسم با مسمیٰ ان کا یہ احسان بھی ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ انھوں نے ہمیں زندہ فارسی سکھائی اور روز مرۂ ایران کی تعلیم دی۔ فارسی کا ایک سلسلہ ان کی اس احسان عظیم کی یادگار ہے (ماخوذ از سیر المصنفین وگلدستہ ادب پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ)

نوٹ نمبر 7۔ صاحب مآثر الامرا۔ عبدالرزاق نام نواب صمصام الدولہ شاہنواز خان خطاب تھا۔ خراسان کے سادات خواف کی نسل سے تھے۔ ان کے پردادا امیر کمال الدین اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے۔ اور آگرہ پہنچ کر امرا کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ امیر کمال الدین کے بیٹے میرک حسین نے شہنشاہ جہانگیر کی ملازمت میں جگہ پائی ان کے بیٹے میرک معین الدین المخاطب بہ امانت خان کو شاہجہاں کے عہد حکومت میں بڑا عروج تھا اور وہ اول درجے کے امرا میں تھے۔ عالمگیر کے زمانہ میں بھی ان کا اقتدار بدستور رہا اور وہ لاہور، ملتان، کابل اور کشمیر وغیرہ جیسے مقامات پر سلطنت کی اہم خدمات پر مامور رہے۔ عالمگیر کی سلطنت میں امانت خان لائق ترین شخص سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے بادشاہ انھیں بہت مانتا تھا۔ 1081ھ میں جب خانجہاں بہادر کوکلتاش دکن کی صوبیداری پر مقرر ہوا ہے تو دکن کی دیوانی اور وقائع نگاری کی خدمت پر امانت خان مامور کیے گئے تھے۔

ان کے چار بیٹے تھے۔ (1) عبدالقادر المخاطب بہ دیانت خاں تحویلدار صرف خاص۔ (2) میر حسین المخاطب بہ امانت خان تحویلدار خزانہ عامرہ وصوبہ دار سورت۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا منصب ان کے بڑے بھائی کو دیا گیا تھا۔ (3) عبدالرحمٰن المخاطب بہ وزارت خان دیوان بیجاپور (مالوہ) یہ اچھے شعرا میں اور صاحب دیوان تھے۔ (4) قاسم خان۔ دیوان ملتان۔

قاسم خان کے بیٹے کا نام میر حسن علی تھا۔ جو نواب صمصام الدولہ شہنواز خان کے باپ تھے شہنواز خان 1111ھ/1700 میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں اورنگ آباد چلے گئے اور اپنے اعزا کے ساتھ

جو پہلے سے جا چکے تھے رہنے سہنے لگے۔ پہلی ملازمت ان کی نظام الملک آصف جاہ کے دربار میں ہوئی۔ اور آصف جاہ اور اس کے بیٹے ناصر جنگ کے عہد حکومت میں کئی سال تک انھوں نے برار کی دیوانی کی خدمت انجام دی۔ صلابت جنگ کے عہد میں ہفت ہزاری کے منصب پر سرفراز ہوئے اور صمصام الدولہ کا خطاب پایا۔ 12 مئی 1758 = 3 رمضان 1171ھ کو عبدالرحمٰن حیدر جنگ کو جو فرانسیسی جرنیل بسی کے مشیر تھے نظام علی برادر صلابت جنگ کے اغوا سے لوگوں نے قتل کر ڈالا اور اسی گڑبڑ میں صمصام الدولہ اور ان کے چھوٹے بیٹے عبدالنبی خان بھی مارے گئے۔ لیکن ان کے دو اور بیٹے میر عبدالسلام و میر عبدالحئی بچ کر نکل گئے۔ دونوں باپ بیٹوں کی لاشیں ان کے آبائی قبرستان میں جو شہر اورنگ آباد کے جنوبی حصے میں واقع ہے دفن ہوئیں۔

شہنواز خان نے ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی۔ جس کا نام ''مآثر الامرائے تیموریہ'' ہے اور اس کتاب میں ان امرا کے حالات زندگی درج کیے تھے جنھوں نے خاندان تیموریہ کے عہد حکومت میں ہندوستان اور دکن میں خدمات انجام دی تھیں۔ لیکن اس کے ختم ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ مصنف کا انتقال ہو گیا۔ اور اس یورش میں اس کے مسودے کے اکثر حصے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ خیال تو یہ کیا جاتا تھا کہ کتاب تلف ہو گئی۔ لیکن ان کے ایک دوست میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامی صاحب تذکرہ سرو آزاد و خزانہ عامرہ وغیرہ (المتوفی 1200ھ/1786) نے اوراق گمشدہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو جمع کیا اور کچھ اضافہ کے ساتھ جس میں مصنف کی سوانح عمری بھی شامل ہے اسے از سر نو مرتب کیا۔ اس کے بعد شاہنواز خان کے بیٹے میر عبدالحئی خان نے جنھیں ان کے والد کے انتقال کے بعد صمصام الدولہ صمصام جنگ کا خطاب ملا اس کتاب کو اصلی موجودہ شکل میں 1779 میں مکمل کیا۔ ان کی وفات 28 اپریل 1782 = 15 جمادی الاول 1196ھ میں واقع ہوئی (از بیاگریفکل ڈکشنری مصنفہ ٹامس ویلم بیل)

مآثر الامراء ایک نہایت جامع و نافع کتاب ہے اور کوئی کتاب اس کا اس امر میں مقابلہ نہیں کر سکتی کہ اس سے امرائے تیموری کے حالات، اس زمانہ کے واقعات، اندرونی بیرونی کوائف بخوبی معلوم ہو سکیں۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب فرد ہے۔ آج جتنی تاریخیں یا تاریخی لغتیں وغیرہ مرتب کی گئی ہیں ان کا ماخذ یہی ہے اس کے مصنف نے کسی شخص کے عیب و ہنر کو کسی وجہ سے بھی چھپایا نہیں۔ غرض یہ ایک نادر اور بے بہا مجموعہ ہے۔

تختِ طاؤس کی وضع اور اس کے لیے سونے اور جواہرات کا عطیہ

اِن جواہرات میں سے چھیاسی لاکھ(86,00,000 [1])روپے کے بیش قیمت جواہرات جن کا وزن پچاس ہزار مثقال[2](8 من 20 سیر 6 چھٹانک 3 تولہ 4 ماشہ) تھا۔منتخب ہو کر حکم ہوا کہ" یہ سب جواہرات ½ 13[3] من(ایک لاکھ تولہ) طلائے خالص(قیمتی چودہ لاکھ(1400000)روپیہ) کے(اس وضع کے) تخت پر جڑ دیئے" اور بے بدل خان مہتمم زر گرخانۂ شاہی اس کے بنوانے پر مامور ہوا۔

تختِ طاؤس کی وضع قطع ، جواہرات کا موزونیت کے ساتھ تعبیہ ہونا ترتیب لون کا خیال پیش نگاہ رکھنا۔تا کہ جواہرات کی کرنوں کی چھوٹ سے ایک رنگا رنگ کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کے علاوہ فنِ عمارت میں بادشاہ کی وسعتِ نظر،عطائے خطابات میں اس کی جدت اور اشیا کے نام رکھنے میں اس کی موزونیت پر نظر کرتے ہوئے خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاہجہاں نے یقیناً اس تخت کی وضع قطع خود اختراع کی ہوگی۔اور بے بدل خان کا انتخاب بھی بجائے خود بادشاہ کی نکتہ سنج ونکتہ نواز طبیعت کے لیے داد طلب ہے۔بے موقع نہ ہوگا اگر بے بدل خان کے حالات بالاختصار بیان کر دیے جائیں۔

مہتمم تختِ طاؤس،اس کے نام کی صحت اس کی قابلیت اور اس میں اس کارِ اہم کی انجام دہی کی اہلیت

بے بدل خان۔سعیدا نام، بے بدل خان(جو حقیقتاً خطاب ہے)مشہور گیلان کا رہنے والا تھا۔ بابو ایشوری پرشاد صاحب ایم۔اے نے اپنی" تاریخ ہندوستان" میں حرف "A" سے امداد فتحی حاصل کرنے کی بجائے اس کو"الف" کا قائم مقام سمجھ کر" بے بادل خان" لکھ دیا ہے۔ انگریزی میں" بے بدل(Bay Badal)"اور" بے بادل(Bay Ba'dal)" دونوں کا املا یکساں ہے۔صرف کھینچ کر پڑھے جانے والے حروف پر ایسٹرس(اعراب یعنی ایک ترچھی لکیر)بنا دیتے ہیں۔غالباً بابو صاحب موصوف نے انگریزی تاریخوں سے حالات اخذ کیے ہوں گے اور کوئی ایسی کتاب نظر سے گذری ہوگی جس میں Badal کے "A"(مابعد"B") پر غلط ایسٹرس ہوگا یا نہ ہوگا اور جلدی میں مطالعہ کرتے ہوئے مغالطہ میں پڑ گئے۔یا جس مصنف کی تاریخ اس ضمن میں دیکھی وہ

انگریز ہوگا۔ جو نا آشنائی زبان فارسی کے باعث "بے بادل" کی معنوی غلطی کو نہ سمجھ کر ایسا لکھ گیا ہوگا۔

سعیدائے گیلانی، جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آ کر سلسلۂ شعرا میں منسلک ہوا کچھ دن بعد اپنے وطن کو واپس گیا۔ اور دوسری مرتبہ پھر آیا۔ شاہجہاں نے اپنے زمانۂ سلطنت میں اسے "بے بدل خان" کے خطاب سے مخاطب کر کے مہتمی زرگر خانۂ شاہی" کی خدمت پر مامور کیا۔ یہ عہدہ اس زمانہ میں بہت ہی وقیع تھا۔ اور اس پر معتمد علیہ بندگان شاہی متعین ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر شاہی جواہرات اسی عہدہ دار کی تحویل میں رہتے تھے۔ بے بدل خان اعلیٰ درجہ کا شاعر، حکاک اور خوش نویس تھا۔ اس نے تخت طاؤس کی خیالی وضع کو جسے شاہجہاں کی موزونیت دماغ نے مرتب کیا تھا، سات سال کی مدت میں عملی جامہ پہنا کر قدر دان اور مبصر بادشاہ کے حضور سے اپنے ہموزن طلائے خالص انعام پایا۔

تاریخ گوئی میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ 1044ھ میں کشمیر سے واپس ہو کر جب شاہجہاں نے "تخت طاؤس" پر پہلا جلوس کیا ہے تو اس نے ایک سو چونتیس (134) بیت کا قصیدہ کہہ کر حضور شاہی میں پیش کیا۔ جس کی ابتدائی بارہ (12) ابیات کے ہر مصرعے سے تاریخ ولادت بادشاہ، ان کے بعد والے بتیس (32) بیتوں کے مصرعے سے تاریخ جلوس شاہجہانی اور بقیہ نوے (90) کے ہر مصرعے سے "تاریخ نہضت کشمیر از آگرہ" و "معاودت آگرہ" و "جلوس بر تخت طاؤس" نکلتی تھی۔

افسوس! امتداد زمانہ کے ہاتھوں یہ جواہر ریزے صفحہ دنیا سے نیست و نابود ہو گئے اور اب صرف ان کا تذکرہ ہی تذکرہ باقی رہ گیا۔ دستیابی قصیدہ کی ہم نے بہت کوشش کی مگر وہ کہاں۔ ع

ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

صاحب مآثر الامرا نے اس کے نتائج قلم سے یہ رباعی حوالۂ قلم کی ہے۔

آنی کہ سریت آسماں پایہ بود بر ملک جہاں عدل تو پیرایہ بود

تا ہست خدا تو نیز خواہی بودن زیرا کہ ہمیشہ ذات با سایہ بود

نوٹ نمبر 1 - صاحب "ظفر نامۂ شاہجہاں" (جلد ہفتم تاریخ ہندوستان مصنفہ مولوی ذکاء اللہ

صاحب مرحوم) نے لکھا ہے۔یہ جواہرات اسی لاکھ (8000000)روپیہ کے تھے۔ اور ملا عبدالحمید لاہوری ''مورخ شاہجہانی'' بادشاہنامہ میں لکھتے ہیں۔مبلغ ہشتاد وشش لک روپیہ بہاے آں شدہ بود' ایک تو یوں ہی صاحب ظفر نامہ ملا صاحب کے مقابلہ میں غیر معتبر ہیں۔دوسرے اگر صاحب ظفر نامہ کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو خود ان کے اور مورخین قدیم کے بیان کے مطابق تخت مذکور کی قیمت ایک کروڑ روپیہ تک پہنچنے میں چھ لاکھ (600000)روپیہ کی کمی رہتی ہے۔اس کے برعکس ملا صاحب کے بیان کے موافق حساب پورا ہو جاتا ہے۔اس لیے بھی ملا صاحب ہی کا بیان زیادہ مستند اور قابل تسلیم ہے مآثر الامراسے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔12

نوٹ نمبر2:-ایک مثقال برابر ہے 5ماشہ کے (دیکھو طامس رو کی تاریخ)12

نوٹ نمبر3:-ظفر نامہ میں ایک لاکھ تولہ سونا اور بادشاہ نامہ میں ''ایک لک تولہ طلائے ناب کہ دوصد پنجاہ ہزار مثقال است'' لکھا ہے۔12

نوٹ نمبر4:-اورینٹل بیاگریفکل ڈکشنری میں بے بدل خان کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔''بے بدل خاں'' ''ابوطالب کلیم'' کا پرانا خطاب معلوم ہوتا ہے''بظاہر مرتب لغت مذکور مندرجہ ذیل متحدہ امور سے یہ دھوکا ہوا۔

(1)دونوں عہد جہانگیری میں اپنے وطن گئے اور شاہجہاں کے عہد میں واپس آئے۔

(2)دونوں نے اپنے اپنے ہم وزن سونا انعام پایا۔

(3)دونوں نے قطعہ تاریخ ''تخت طاؤس'' اور قصیدہ تہنیت جشن جلوس تخت مذکور پیش کیا۔

مگر امور ذیل شبہات مذکورہ بالا کو رفع کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ''ابوطالب کلیم'' اور ''بے بدل خان'' دو علاحدہ علاحدہ شخصیتیں تھیں۔

(1)بے بدل خان عام شعرا میں تھا اور ابوطالب کلیم ''ملک الشعرائے'' دربار۔

(2)بے بدل خان صرف ایک مرتبہ وطن جاکر واپس آیا۔لیکن کلیم تین مرتبہ گیا اور واپس آیا۔

(3)بے بدل خان ''گیلان'' کا اور ابوطالب کلیم ''ہمدان'' کا رہنے والا تھا۔

(اخذ از مضمون ''مہتمم تخت طاؤس'' نوشتہ برادر بجان برابر منشی منظور لطیف خان صاحب رسالہ ''فانوس'' جھانسی بابتہ جنوری 1927)

تخت طاؤس کی تصویر

میں نے باستثنائے کلکتہ قریب قریب ہندوستان کے تمام مشہور عجائب خانوں کی سیر کی ہے اور برابر تخت طاؤس کی تصویر کا جویا رہا۔لیکن میری متلاشی نظریں ناکام ہی رہیں اور دریافت سے معلوم ہوا کہ کلکتہ میں بھی کوئی تصویر موجود نہیں۔

اس زمانہ میں کہ میں اس کے حالات قلمبند کر رہا ہوں میں نے دورِ حاضرہ کے مشہور مورخ منشی سعید احمد صاحب مارہروی (صاحب ''امرائے ہنود'' وغیرہ) سے اس معاملہ میں دریافت کیا۔موصوف نے تحریر فرمایا۔

''تخت طاؤس کی کوئی تصویر نظر سے نہیں گزری۔لفظی تصویر مآثر الامرا سے نقل کر کے بھیجتا ہوں''۔

عرصہ ہوا کہ بہادر شاہ یا اکبر شاہ ثانی کے بنوائے ہوئے تخت طاؤس کی ایک قلمی تصویر قلعہ معلّٰی دہلی میں موجود تھی۔جس کو لوگ غلطی سے شاہجہانی تخت طاؤس کی شبیہ سمجھا کیے اور اب وہ بھی معدوم ہے۔البتہ اسی کی عکسی تصویر ''لون 2گز بیشن آف ایمپٹی کوئیٹر کارونیشن دربار 1911'' نامی کتاب کے صفحہ 152 پر ضرور موجود ہے۔

نوٹ نمبر 1۔سعید احمد۔آپ مارہرہ کے رہنے والے ہیں۔کلکٹری آگرہ کے اہلمد اور اپنے زرین کارناموں کے باعث سرسید ثانی ہیں۔اتفاق سے آپ کے نام نامی اور سید مرحوم کے اسم گرامی میں تجنیس زائد کا علاقہ بھی ہے۔

آپ نے آگرہ میں انجمن محمدیہ کی بنا ڈالی ہے۔جو رجسٹرڈ باڈی اور بہت سے رفاہ عام کاموں پر حاوی ہے۔اس انجمن کے تحت میں صغیر فاطمہ نسواں اسکول،شعیب محمدیہ ہائی اسکول،مدرسہ محمدیہ اور کئی ایک مشنری مدارس ہیں۔یہ مدرسے یوپی کے مدارس اسلامیہ میں بہت ممتاز ہیں۔

آپ کو فن تاریخ سے خاص طور پر دلچسپی ہے اور اس میں کئی مستند اور مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف ''امرائے ہنود'' ہے۔جس میں عہد اسلامی خصوصاً دولت تیموریہ کے ہندو امرا کا تذکرہ ہے۔آپ انجمن محمدیہ کی اعزازی نظامت اور شعیب ہائی اسکول کی منیجری کی خدمات اپنی ملازمتی مصروفیتوں کے

ساتھ ساتھ بہت ایمانداری و بیدار مغزی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ عرصہ تک زندہ رہیں اردو فارسی کے ماہرین سے ہیں۔

نوٹ نمبر2- Lawn Exhibition of antiquities, coronation Durbar 1911 A.D

ایک غلط تصویر

بک آف نالج (کتاب المعارف) میں جہاں چند سطور میں اس کے حالات پر روشنی ڈالی ہے وہاں اس کی تصویر بھی ہے۔ جو یہ ہے:

ایک مرصع ہشت پہل تخت، اس کے چاروں طرف بطور حاشیہ چند تختے لگے ہوئے مگر سامنے کے رخ کا درمیانی حصہ تختوں سے عاری، پشت کی طرف رسمی تکیہ گاہ جس پر اِدھر اُدھر دو چڑیاں بنی ہوئیں۔ چھت وغیرہ کچھ نہیں، چڑھنے کے لیے تین جڑاؤ سیڑھیاں"

بظاہر تو یہ تصویر اصول فروغ تجارت کو مد نظر رکھ کر کتاب میں دی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح سے کہ اسی کتاب میں ایک خیالی تصویر پیمبر آخر الزمان (حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی بھی ہے اور جس کی بدولت اواخر 1925 میں اخبارات و رسائل کتاب مذکور پر بہت کچھ لعن طعن کر چکے ہیں۔ کیونکہ تخت طاؤس کی شبیہ جو مورخین نے اپنی سندی قلموں سے صفحہ تاریخ پر کھینچی ہے اس سے یہ بالکل مختلف ہے۔ مگر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ دراصل ایسا نہیں بلکہ تخت طاؤسی ساختہ ایران (جس کا حال ہم آگے چل کر بیان کریں گے) کا عکس ہے۔ جس کی صاحب کتاب نے تشریح نہیں کی۔ کیونکہ لارڈ کرزن 1 آنجہانی کا بیان میری رائے کا موئید ہے موصوف فرماتے ہیں:

" آج کل اس تخت کے صرف بعض حصص باقی رہ گئے ہیں۔ جو ٹیورنیئر کے نوشتہ (مذکورہ بالا) مفصل حالات کا جزو ہیں۔ چھتری کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ چھت موجودہ تخت پر کس طرح قائم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ طاؤس بھی نہیں۔ اوران تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ خیال پایہ یقین کو پہنچتا ہے کہ موجودہ تخت طاؤس کا دہلی کے لوٹے ہوئے اصلی تخت طاؤس سے اگر کوئی تعلق ہے تو صرف علاقہ ہمنائی 2۔

نوٹ نمبر 1-لارڈ کرزن۔ 1899 میں جبکہ ان کی عمر 40 سال سے کچھ کم تھی وائسرائے ہند مقرر ہوئے۔اور بڑی قابلیت سے وائسرائلٹی کی خدمات انجام دیتے رہے۔وہ خیالات اور طرز حکومت میں لارڈ ڈلہوزی سے مشابہ تھے۔ان کی حکمت عملی ہندستانیوں میں مقبول نہ ہوئی 1905 میں سپہ سالار ہند کے محکمہ کا جو نظام تجویز ہوا تھا،اس کی بابت ان میں اور لارڈ کچنر (سپہ سالار ہند) میں کچھ اختلاف رائے ہوا۔وزیر ہند نے لارڈ کچنر کی رائے کو ترجیح دی۔اسی بنا پر وہ مستعفی ہو کر ولایت چلے گئے۔اور 1925 میں وفات پائی۔

لارڈ کرزن آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ،بیدار مغز،لائق،ادیب،انگریزی کے اعلیٰ انشا پرداز اور انگلستان کے ان مایۂ ناز فرزندوں میں تھے جنھیں مشرق وسطےٰ کی سیاسیات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔وہ مشرق کی سیاسیات کے متعلق ایک معرکۃ الآرا تصنیف چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوئے۔

خلد نشیں ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند نے انھی کے زمانہ وائسرائلٹی میں 1925 میں انتقال کیا۔1903 کا جشن دربار تاجپوشی فردوس آرام گاہ ایڈورڈ ہفتم انھیں کے عہد میں ہوا جس کا تزک و احتشام آج تک ضرب المثل ہے۔تقسیم بنگال ان ہی کے زمانہ میں ہوئی اور ایکٹ انتقال اراضی ان ہی کی یادگار ہے۔

انھیں تاریخ اور تاریخی عمارات سے علی الخصوص بے حد دلچسپی تھی،محکمۂ آثار قدیمہ جس نے مغلوں کی صدہا عمارات کو دستبرد زمانہ سے بچا کر ان کی یاد کو تازہ کر رکھا ہے ان کے وائسرائلٹی کے زمانہ کی ایک نمایاں یادگار ہے۔

تاریخی حلقہ میں ان کی تصنیف ''پرشیا اینڈ دی پرشین کوئیچن'' جو ان کا سفرنامہ ایران ہے موقر نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

بہت حسین آدمی تھے۔ڈاڑھی موچھ منڈواتے تھے۔ہندستانیوں میں یہ طرز ان کی یادگار خاص اور ''کرزن فیشن'' کے نام سے آج تک موسوم ہے(بامداد تاریخ ہند ایشری پرشاد)

نوٹ نمبر 2-پرشیا اینڈ دی پرشین کوئیچن-12

ایک معاون تصور تصویر

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی ''تاریخ ہند'' میں جو صوبۂ یو۔پی کے انگریزی مدارس کے نصاب میں داخل ہے ''شاہجہاں بر تخت طاؤس'' کے عنوان سے ایک تصویر دی ہے جو ہماری نظر میں مشکوک ہے۔کیونکہ مورخین قدیم بارہ ستون بیان کرتے ہیں۔اور اس میں صرف چار

ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے یہ تصویر کہاں سے لی ہے؟ نہ اس کا کہیں تذکرہ ہے اور نہ ہمارے استفسار کے جواب میں موصوف نے بتلایا کہ اس کی صحت یا غلطی کے متعلق ہم کسی خاص فیصلہ تک پہنچتے تاہم "تخت طاؤس" کے تخیل میں یہ تصویر بہت معاونت کرسکتی ہے۔

تخت طاؤس کی ہیئت

مورخین میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔اس لیے حیران ہوں کہ کس طرح تخت مذکور کا نقشہ اپنے ناظرین کے ذہن نشین کروں؟ بہر حال قدیم باکمال اور مسلم الثبوت مصوروں کی صفحہ تاریخ پر کھینچی ہوئی لفظی تصاویر سامنے رکھ کر جو تصویر میں نے اپنے دماغی عکس گیر (کیمرے) میں تیار کی ہے۔اس کو نذر ناظرین کرتا ہوں۔ یہ تصویر زیادہ تر صاحب ظفر نامۂ شاہجہاں، صاحب بادشاہ نامہ اور صاحب مآثر الامراء جیسی مستند شخصیتوں کی کشیدہ شبیہ قلمی سے ماخوذ ہے لیکن کہیں کہیں دوسرے مصوران حالات پاستانیاں کے یہاں سے بھی رنگ و روغن لے کر آرائش و زیبائش کی گئی ہے۔

طول، عرض اور بلندی

یہ تخت 3½ گز 1 (حسب بیان ٹیورنیر 6 فٹ) طویل 2 ، 2½ گز (حسب بیان ٹیورنیر 4 فٹ) عریض 3 ، 5 گز (حسب بیان ٹیورنیر 8 فٹ) بلند 4 اور مثمن 5 تھا۔ جس میں ایک سو آٹھ لعل (125) رتی سے ڈھائی سو 250 رتی تک کے وزنی) اور ایک سو ساٹھ / 160) زمرد (36 سے 72 رتی وزن تک کے) جڑے ہوئے تھے 6۔اور دو۔ دو فٹ اونچے چھ طلائی مرصع پایوں پر قائم تھا۔

نوٹ نمبر 1۔سرکاری عمارتی گز بقول ابوالفضل 32 طسوج کے برابر اور درزی کا گز 16 گرہ کا ہوتا تھا۔ہمارے یہاں کا عمارتی گز اب بھی وہی ہے۔جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں تھا۔(کشتہ قادری)12

نوٹ نمبر 2-5-دیول انڈیا مصنفہ لین پول۔12

نوٹ نمبر 6-تاریخ ہندوستان قسط سوم۔شائع کردہ مالکان بڑی جنتری۔ بڑی جنتری بابتہ سال 1894۔12

پایوں کے متعلق ایک خاص بیان

ہندستانی مورخین قدیم نے تو پایوں کا بیان قطعی نظرانداز کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر 1 برنیر اور ٹیورنیر 2 نے ان کا ذکر کیا ہے۔ برنیر لکھتا ہے:

''یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے۔ جن کے متعلق کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں۔ ان میں یاقوت، زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں کہ ان کا شمار اور آب و تاب کا اندازہ کر سکے۔ لیکن یقین کیجیے کہ ہیرے اور جواہرات بہت ہی ہیں 3''۔

اور لین پول صاحب ''سوانح اورنگ زیب'' کے حواشی میں ٹیورنیر کا بیان لکھتے ہیں:

''تخت ہذا چار پایوں کی بڑی چوکی کی وضع کا تھا (اس میں چھ پائے نہ تھے)''

بخلاف اس کے اسی سیاح کا قول جو لارڈ کرزن نے اپنی کتاب موسومہ پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن میں نقل کیا ہے اس میں سات پائے بیان کیے گئے ہیں۔ بہرحال میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو چھ پائے کہتے ہیں۔ کیونکہ ایک مثمن تخت کا توازن نہ بغیر چھ پایوں کے کسی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ اس میں کسی خاص کمی و بیشی کی ضرورت۔

نوٹ نمبر 1 - برنیر۔ فرانسس برنیر نام، ملک فرانس کے شہر انجرس میں پیدا ہوا۔ سال پیدائش محقق نہیں۔ ڈاکٹر دول ٹیر 1625 سنہ ولادت بتلاتے ہیں۔ صاحب جیمبرس بیا گریفیل ڈکشنری نے 1654 لکھا ہے۔ لیکن وقائع سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب کے دیباچہ سے جہاں اس نامور سیاح کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ میں اس نے ملک شام کا سفر کیا تھا۔ اس کی وسعت سیاحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر دول ٹیر کا ہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ برنیر نے مونٹ پیر میں علم طب کو تحصیل کر کے علامہ طبیعات (ڈاکٹر آف فزیک) کا فاضلانہ مرتبہ (ڈگری) حاصل کیا۔ وہ طبعاً سیر و سیاحت کا ہمیشہ سے شائق تھا۔ تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی وہ اس طرف مائل ہو گیا۔ 1654 میں وہ ملک شام کو گیا۔ وہاں سے ملک مصر پہنچا۔ ایک سال سے زائد قاہرہ (پایہ تخت مصر) میں قیام پذیر رہا۔ پھر ہندوستان آیا اور بندرگاہ سورت پر اترا۔ جس زمانہ میں یہ ہندوستان پہنچا ہے۔ عالمگیر اور اس کے بھائیوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ داراشکوہ جب اجمیر سے احمد آباد کی طرف

بھاگا ہے۔ تو چونکہ اس کے ساتھ کوئی طبیب نہ تھا اور ایک بیگم کے پیر میں خطرناک زخم تھا۔لہٰذا اس نے برنیر کو جبراً اپنے ساتھ لے لیا۔ دارا شکوہ راجہ کچھ سے مشکوک ہوکر ٹھٹھ کی طرف گیا تو برنیر کولیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ جنھوں نے بڑی مشکل سے 8 دن اس کو نظر بند رکھ کر رہا کیا۔ اور احمد آباد کے قریب پہنچا دیا۔ وہاں اس کی ایک امیر سے ملاقات ہوگئی اور اُس امیر نے اس کو دہلی تک پہنچایا۔ برنیر ہندوستان میں بارہ برس تک رہا۔ جس میں سے 8 سال تک اس نے عالمگیر کے طبیب خاص کی خدمات انجام دیں اور بقیہ زمانہ ملا شفیعائے یزدی المخاطب بہ نواب دانشمند خاں کی ملازمت میں بسر کیا۔

نواب دانشمند خاں عہد عالمگیر اور عہد شاہجہاں کے باکمال لوگوں میں سے تھا۔ یہ شخص فلسفہ، ہیئت اور ہندسہ میں بالتخصیص مشہور و معروف تھا اور ایسا زبردست عالم تھا کہ نعمت خاں عالی جیسا فاضل اس کا شاگرد تھا۔ شاہجہاں نے محض اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر جبکہ وہ اپنے وطن کو تجارت کے کاروبار سے فارغ ہوکر واپس جارہا تھا۔ بندر سورت سے واپس بلا کر امرائے دربار میں داخل کر لیا تھا۔ عالمگیر کے عہد میں یہ سوار فوج کے میر بخشی کے عہدے سے ترقی کر کے وزیر خارجہ کے عہدے پر ممتاز ہو گیا تھا۔ صرف ایک یہی ایسا امیر تھا کہ جس کو اس کے شغف علمی کی وجہ سے شام کے دربار غسل خانہ کی حاضری سے جس میں ہر امیر کا حاضر ہونا لازمی تھا مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ یہ صرف چہار شنبہ کو کہ اس کی چوکی کا دن تھا۔ دربار مذکور میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس فاضل اجل نے 1080ھ میں وفات پائی۔

میں برنیر کا ذکر کرتے کرتے نواب دانشمند خاں کا تذکرہ کرنے لگا۔ خیر غرض یہ کہ برنیر دربارشاہی میں تین سو روپیہ ماہانہ پاتا تھا (جو اس زمانہ میں ایک بڑی تنخواہ تھی) اور ذی عزت عہدہ داروں کے زمرہ میں شمار ہوتا تھا۔ وہ 1670 میں فرانس واپس گیا۔ اور اس نے 1671 میں اپنا مشہور و معروف سفرنامہ شائع کیا۔ اس سفرنامہ کا انگریزی ترجمہ جو کانسٹبل (المتوفی 21۔ جولائی 1827) کے یہاں سے 1893 میں شائع ہوا بہترین ہے۔ (کانسٹبل ایک وہ ہستی تھی جس کے دنیائے علم پر صدہا احسانات ہیں اسی معزز کتب فروش نے 1882 میں انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کا حق تصنیف 13 ہزار (13000) پونڈ میں خریدا تھا) 1688 میں برنیر نے اس غم سے انتقال کیا کہ ڈی ہارے اولین صدر جمہوریہ فرانس نے جلسہ عام میں اس کی نسبت سخت لعن طعن کی تھی۔ برنیر ایک خوشرو، موزوں قد، خلیق، صاحب سلیقہ و پسندیدہ عادات، خوش تقریر اور بلیغ آدمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سینٹ ایورمانٹ جو

ابتدائے سن تمیز میں ایک پادری۔ حدید الطبع، عجیب وغریب قابلیتوں کا جامع، نامور فاضل اور سیاحی تھا اور کچھ ہی ہو کسی کی ہجو کر دینے، اور کسی پر پھبتی کس دینے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ برنیر کو "خوب صورت فلسفی" کہا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ان تمام قابلیتوں کے ساتھ ہی اپنے فلسفیانہ خیالات میں جن کو فلسفہ کہہ کر اس لفظ کی مٹی خراب کرتا ہے۔ حکیم اپی کیورس یونانی کا پیرو تھا۔ وہ اپنے استاد گیسینڈی کا (جس سے اس نے فلسفہ کی تعلیم پائی تھی) نہایت معتقد تھا۔ اور مذہب عیسوی کے مسلمہ مسائل الہامیہ کا منکر اور بے دین فلسفیوں کے ملحدانہ تخیلات کا قائل۔

وہ تحقیقات کا شیدا تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں فلسفہ الٰہیات وغیرہ پر لکھیں جو اب نامقبول ہیں۔ وہ فن وقائع نگاری و تاریخ نویسی میں اہل یورپ کے نزدیک مسلم و عدیم النظیر ہے۔ اقوام مغرب اسے اس فن میں استاد مانتی ہیں۔ وہ جس چیز کا ذکر کرتا ہے اس کی تصویر نظر کے سامنے کھینچ جاتی ہے۔ اس کا سفر نامہ بہت ہی مقبول ہوا۔ جس سے اس زمانہ کی تہذیب، آئین سلاطین، طریق دربار و سزا و جزا، وضع قطع، تراش خراش اور ہر ہر چیز پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر برنیر اور اس کے سفرنامے کے متعلق مسٹر سرکار نے جو رائے قائم کی ہے وہ مختلف صورتوں سے اسی کتاب کے متن وحواشی میں جا بجا درج کی جا چکی ہے۔ جس سے موصوف کی نظر میں اس کی بے اعتباری ظاہر ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس کا طرز بیان بہت ہی دلچسپ اور اس کی تحقیقات بے حد قابل داد اور پرمنفعت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے تعصب نے اس کو اتنا موقر نہ رکھا۔ جتنا کہ اس کو ہونا چاہیے تھا۔ اس کی عادت ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ لیکن اپنے اور اپنی قوم کے انھیں عیوب کو نظر انداز کر جاتا ہے اور کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے 10 جون 1668 کے ایک خط موسومہ مسٹر چیپ لین میں جو شیراز سے لکھا گیا تھا۔ ہندوؤں کے عقائد سے بحث کرتے ہوئے ان کے طریق عبادت و بت پرستی پر اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ وہ خود جس مذہب کا متبع تھا اس میں حضرت مسیح علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام کی شبیہیں اور پطرس حواری کے جوتے کی نقل رکھی جاتی مقدس جان کر ان کی پرستش کی جاتی اور ہندوؤں کی طرف دوپ دیپ دے کر گھنٹے بجائے جاتے ہیں۔ یا اس نے سفرائے حبش کا جو دربار مغل میں آئے تھے گھوڑے کا گوشت کھانے پر بہت مذاق اڑایا ہے۔ حالانکہ اس کی قوم خود ایک زمانہ میں بہ شوق اس کو کھاتی رہی ہے۔ تعصب نے اس سے عیب راہنر باید کے حکیمانہ مقولے پر بھی عمل نہ کرنے دیا۔ اس نے سلاطین، شاہزادگان اور بیگمات تیموری کے متہم کرنے کو اپنا نصب العین بنایا۔ چنانچہ قلم کی روانی میں شاہجہاں، جہاں آرا اور روشن آرا وغیرہ پر صد ہا بیجا ناممکن اور بدنما الزام لگا دیے اور اس

سے اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ مغلوں کے خلاف اپنی قوم کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرے فن سیاسیات کے ماہر ہی اس نکتہ کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کیا پانڈیچری پر فرانسیسی جماؤ اور فرانسیسیوں کا گھور گھور کر ہندوستان کی طرف دیکھنا اس پروپیگنڈے کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو یوں کہیے کہ اقبال برطانیہ کے آگے فرانسیسیوں کا چراغ گل ہو گیا ورنہ آج ہندوستان انھیں کے زیر نگیں ہوتا۔

نوٹ نمبر 2۔ ٹیورنیر۔ جین بپٹسٹ ٹیورنیر نام، بیرن ڈی آبان لقب، اینٹورپ کے ایک لکڑی پر نقش ونگار کرنے والے کا بیٹا تھا۔ 1605 میں پیرس میں پیدا ہوا۔ جواہرات کا بہت بڑا مبصر اور تاجر تھا۔ اس نے ایک جوہری کی حیثیت سے مغربی یورپ اور ایشیا کے بیشتر حصوں اور ملکوں کی سیاحت کی۔ اس نے بہ تفصیل ذیل چھ سفر کیے:

(1) 1631 سے 1633 تک اس سفر میں وہ قسطنطنیہ کے راستے سے ایران گیا اور وہاں سے مالٹا ہوتا ہوا اٹلی پہنچا۔

(2) 1638 سے 1643 تک اس سفر میں ملک شام طے کر کے اصفہان اور آگرہ ہوتا ہوا گولکنڈہ پہنچا۔

(3) 1643 سے 1649 تک اس سفر میں اصفہان ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا اور وہاں سے بٹیویا (جاوہ) ہوتا ہوا بینٹم کو گیا۔ اور وہاں سے راس امید کی راہ سے ہالینڈ۔

(4) 1651 سے 1655 تک۔ (5) 1657 سے 1662 تک۔ (6) 1663 سے 1668 تک۔

ان آخری تین سفروں میں اس نے زیادہ تر ہندوستان اور ایران کی سیاحت کی 1669 میں لوئس چہاردہم نے اسے خاص خطوط وافر میں عنایت کیے اور اگلے سال اس نے جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کے قریب آبان کا تعلقہ خریدا۔ 1684 میں وہ الکٹر آف برنیڈن برگ کی مشرقی تجارتی تجاویز میں مشورہ دینے کے لیے برلن گیا 1689 میں اس نے بمقام ماسکو انتقال کیا۔ اس کے مشہور ومعروف چھ سفر 1676 میں چھپے اور ان کا تتمہ 1679 میں شائع ہوا۔ 1810 اور 1882 میں اس کے سفرنامے کے دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں (از چیمبرس بیاگرفیکل ڈکشنری) ٹیورنیر کا ماخذ بہت کچھ برنیر کا سفرنامہ اور سنی سنائی باتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر سرکار نے اس کو بھی کچھ زیادہ معتبر نہیں سمجھا ہے۔ اس کے بیانات برنیر کے مقابلہ میں زیادہ وقیع نہیں کیونکہ وہ دربار شاہی سے ایک خاص

تعلق رکھتا تھااور یہ محض ایک جوہری کی حیثیت سے دربار و درباریوں میں آتا جاتا تھا۔ چونکہ ٹیورنیر برنیر کا ہم قوم، ہم مذہب، سیاحت میں ہم خیال تھااور بہت کچھ اسی کے بیانات سے اخذ کرتا تھا اس لیے وہ ہر حیثیت سے اس کا مقلد ثابت ہوا۔ یہ بھی سخت متعصب اور آل تیمور کا بدنام کنندہ تھا۔ میرے خیال میں باشندگان ممالک خارجہ کو (خواہ وہ سفیر ہوں، تاجر ہوں یا سیاح ہوں) ملکی آدمیوں کی طرح معلومات بہم نہیں پہنچ سکتی ہے۔ برنیر یا ٹیورنیر کے بیانات کو ہمیں نظر انداز کرنا چاہیے۔ ہاں جس جگہ کسی وجہ سے یہاں کے ملکی مورخین خاموش ہوں اس جگہ ان لوگوں کی تصانیف دیکھ کر اور کھرے کھوٹے کا امتیاز کر کے خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کر لینا چاہیے۔12

نوٹ نمبر 3۔ وقائع سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب۔12

حاشیہ

تخت کے گرداگرد گیارہ تختے مرصع و مغرق بجواہر تکئے کے لیے بطور حاشیے کے لگے ہوئے تھے1۔ اور صرف بیچ کا تختہ جو صدر میں بادشاہ کے تکیہ لگانے کے لیے بنایا گیا تھا دس لاکھ (10,00000) روپے میں تیار ہوا تھا۔ اور کثرت جواہر سے مجموعۂ جواہرات بنا ہوا تھا۔2

لوٹ نمبر 1 و 2 - بادشاہ نامہ، ظفر نامہ شاہجہاں، سیر المتاخرین، سفرنامہ برنیر اور مآثر الامراء-12

ایک تاریخی لعل

اس تخت میں یوں تو بڑے بڑے بیش قیمت، بے نظیر اور عدیم المثال جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ لیکن ایک بیش بہا، نادر، نایاب اور تاریخی لعل خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس خصوصیت ذکر کی وجہ یہ کہ عام طور پر حصول جواہر میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اُن کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بخوف تکرار یہاں وضاحت نہیں کی جاتی، پھر بھی اس کنائے کے بغیر چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ لفظ ''تعبیہ'' کی تفہیم کے ساتھ جواہر تراشی کی دقتوں کی جانب بھی اشارہ کیا جائے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ناری الاصل صخور نہایت ہی سخت اور صلد ہوتے ہیں۔ ان کا کاٹنا ایک نہایت اہم امر ہے اور اس وقت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ ان جواہرات کو کسی خاص ہندسی شکل کے موافق تراشنا مقصود ہو۔ جس میں زاویوں اور ضلعوں کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ ایک ضلع پر دوسرے ضلع اور ایک زاویہ پر دوسرے زاویہ کا اس طرح سے پیوست ہونا کہ دو

جواہرات مل کر ایک چیز معلوم ہوں۔ حقیقتاً صنعت کی ایک عجوبہ کاری ہے کہ جس کی مثالیں اب ناپید ہورہی ہیں۔ سننے میں تو لفظ ''تعبیہ'' سے ایک معمولی کام کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس عرق ریزی، جگر خراشی اور جانفشانی کی داد ہم اس وقت دے سکتے ہیں جب پورے طریقے سے ان دقتوں کو محسوس کریں۔ جوفن جواہر تراشی میں صنعت کاروں کو پیش آتی ہیں۔ اس لعل پر ہر اس شخص نے جس کے بھی وہ قبضہ میں رہ چکا تھا اپنا اپنا نام کندہ کرایا تھا اور سب سے زیادہ عجیب وسخت ترین درجہ اس لعل کے تعبیہ کرنے میں یہی تھا کہ جن لوگوں کے نام کندہ تھے وہ اپنی پوری حیثیت سے اس میں قائم رہ جائیں اور تعبیہ ہونے میں لعل کی خوشنمائی میں بھی کوئی فرق نہ آئے۔ چنانچہ امیر تیمور'' صاحب قران اول''، مرزا1 شاہرخ، مرزا2 الغ بیگ اور شاہ عباس3 صفوی اول بادشاہ ایران کے اسمائے گرامی اس پر پہلے سے کندہ تھے اور جب شاہ عباس موصوف الصدر نے 1620 میں اپنے سفیر زنبیل بیگ کے توسط سے بہت سی بیش بہا اور نادر اشیا کے ساتھ یہ لعل جہانگیر کو تحفتاً بھیجا ہے4 تو جہانگیر نے اپنے باپ اکبر کے نام کے ساتھ اپنا نام کندہ کرا کے علامی5۔ افضل خاں کے ذریعہ سے شاہجہاں کو فتح دکن کے صلہ میں مرحمت فرمایا تھا6۔ شاہجہاں نے اس پر اپنا نام منقوش کرا کے تخت طاؤس کی تکیہ گاہ میں جڑوا دیا7۔ اس عجوبۂ روزگار لعل کی قیمت ایک لاکھ (100000) روپیہ تھی8۔

نوٹ نمبر1۔ مرزا شاہ رخ۔ امیر تیمور صاحقران کا چوتھا بیٹا 14۔ ربیع الاول 779ھ مطابق 21۔ جولائی 1377 کو پیدا ہوا۔ باپ کے ساتھ بہت سی لڑائیوں میں شریک رہا۔ چنانچہ فتوحات ہندوستان اسی کی قوت بازو کا نتیجہ تھیں۔ باپ کے انتقال پر 1409 میں خراسان کا حاکم تھا۔ وہیں کا مستقل فرمانروا ہو گیا۔ 811ھ/1408 میں جبکہ اس کا برادرزادہ سلطان خلیل مرزا فرمانروائے سمرقند قید ہوگیا۔ تو یہ فوجیں لے کر بڑھا۔ اور اس کے ممالک پر قبضہ کرنے کے علاوہ ایران، توران اور قریب قریب ان تمام ممالک پر جو امیر تیمور کے قبضے میں تھے متصرف ہو کر ان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے 42-43 سال تک حکمرانی کی اور 25 ذی الحجہ 850ھ = 12 مارچ 1447 کو فارسی نوروز (اتوار) کے دن جبکہ بحساب شمسی اس کی عمر 70 سال کے قریب تھی بمقام فشاورد (علاقہ رئی) وفات پائی۔ پانچ بیٹے، مرزا الغ بیگ، ابراہیم مرزا، مرزا بایسنقر، مرزا میر غمش اور محمد

جوگی یادگار چھوڑے۔ بہت ہی خشک مزاج، بہادر اور صلح پسند بادشاہ تھا۔ باجودیکہ 42۔43 سال حکمرانی کی۔ لیکن سوائے قبیلہ ترکمان کے (جو ایشیا مائی نر میں آباد تھا اور جسے امیر تیمور نے مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اچھی طرح قابو میں نہ آیا تھا) اور کسی سے نہ لڑا باوجود خشک مزاجی کے لالچی نہ تھا۔ (اورینٹل بیاگرافکل ڈکشنری۔ تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ)

نوٹ نمبر2۔ مرزا الغ بیگ۔ الغ بیغ بھی مشہور ہے۔ مرزا شاہرخ کا بیٹا اور امیر تیمور کا پوتا تھا۔ اپنے باپ کے زمانہ حیات میں 40 سال تک سمرقند کا حاکم رہا باپ کی وفات پر 851ھ/1447 میں تخت حکومت پر جلوس کیا۔ وہ ایک بہت ہی بدقسمت آدمی تھا کہ خانہ جنگی کا شکار ہو کر قید کر لیا گیا اور اس کے بیٹے مرزا عبداللطیف نے 27۔ اکتوبر 1449 = 853ھ میں اس کو قتل کر ڈالا۔ یہ تاریخی نکتہ ہے کہ پدر کش سلاطین خود بھی زیادہ دنوں زندہ نہ رہ پائے اور ان کو چین سے سلطنت کرنا میسر نہ آیا۔ چنانچہ اس شہزادے نے اتنے بڑے جرم کا مرتکب ہو کر سلطنت حاصل کی اور صرف 6 مہینے سلطنت کرنے کے بعد اپنی فوج کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا اور خسر الدنیا والاخرہ کا مصداق بنا۔

مرزا الغ بیگ علوم وفنون کا شیدا اور تعلیم وتعلم کا عاشق زار تھا۔ اس نے خود بھی بہت زیادہ تعلیم حاصل کی تھی اور ساری عمر تعلیم وتربیت پر زور دینے میں گزاری وہ لڑائی سے ہمیشہ بالکل الگ تھلگ رہا۔ فن نجوم میں اس کو مہارت تامہ حاصل تھی اور اس سے اس کو بہت زیادہ دلچسپی بھی تھی۔ اس نے اپنے ممالک محروسہ کے تمام نجومیوں اور اس زمانہ کے تمام آلات کو پایۂ تخت میں جمع کر کے دلچسپ تحقیقاتیں کیں اور مفید معلوم بہم پہنچائی۔ زیچ الغ بیگ اسی زمانہ کی تحقیق وتفتیش کا نتیجہ ہے یہ علم ہیئت ونجوم کی ایک مشہور ومعروف کتاب ہے۔ اس نے ایک رصدگاہ بنوائی تھی۔ جس کی بلندی سینٹ ابا صوفیہ (قسطنطنیہ کا مشہور ومعروف گرجا جس کو ترکوں نے مسجد بنا لیا ہے اور اب مسجد اباصوفیہ کہلاتا ہے) کے برابر یعنی 180 (رومن) فٹ ہے۔

مرزا مسطور نے 1434 کے ثوابت (قائم رہنے والے ستاروں) کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ جس کو 1656 میں ہائیڈ پریس آکسفورڈ نے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ (ماخوذ از اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری۔ مولفہ ہنری جارج کین)۔12

نوٹ نمبر3۔ شاہ عباس صفوی اول۔ صفوی خاندان کا ساتواں بادشاہ جس کو پرانے زمانہ کی تاریخوں میں ''عباس ماضی'' لکھا گیا ہے۔

بروز دوشنبہ 29 جنوری 1571 مطابق یکم رمضان 978ھ پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اس کو امرائے خراسان نے 1586 میں تخت نشین کیا۔ اکبر و جہانگیر کا ہمعصر تھا حدود سلطنت کے بڑھانے میں اس نے بہت سعی کی۔ 1622 میں مغربی اقوام سے آرموس (جزیرہ آئی لینڈ) چھین لیا۔ یہ جزیرہ ایک سو بائیس سال سے پرتگالیوں کے قبضے میں تھا۔ عراق عرب کو مسخر کیا۔ ترکوں سے برابر کی صلح کی۔ ازبکوں سے خراسان چھینا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارے ایران کو اپنے زیر نگین کرلیا۔ یہ سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے اصفہان کو پایۂ تخت بنایا۔ 44 سال حکومت کرنے کے بعد ساٹھ سال کی عمر 24- جمادی الاول 1038ھ مطابق 1629 میں انتقال کیا۔

شاہ عباس بہت ہی چالاک، خوش مزاج، بہادر، علم دوست، ہنر شناس اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔ اس کا دربار بھی مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا مرکز تھا۔ یہ شیعی المذہب تھا اور تشیع میں اسے بہت غلو تھا۔ وہ وسعت حکومت اور انتظامات ملکی میں دوسرا اکبر یا شاہجہاں تھا۔ اس نے ملک کے امن وامان، آبادی و سرسبزی کے لیے جو کام کیے ہندوستان کا تیموری خاندان بھی نہ کرسکا اس نے اس سرے سے اُس سرے تک کاروان سرائیں بنوائی تھیں جن میں مسافروں کے لیے سلطنت کی طرف سے تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں۔

اس میں اور اکبر میں علیٰ ہذا اس کے اہلکاروں، امراؤ اعیان سلطنت اور اکبر کے متوسلین و امرائے دولت میں اکثر معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔

لطیفہ۔ ایک مرتبہ شاہ عباس نے ملا وحید طاہر کی یہ رباعی اکبر کے دربار میں بھیجی۔ جس میں درپردہ اپنی تعریف اور اکبر پر چوٹ تھی۔

زنگی بہ سپاہ خیل و لشکر نازد — رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد — عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

فیضی نے فی البدیہہ یہ رباعی کہہ کر پیش کی۔ جو جواباً دربار ایران میں بھیجی گئی۔

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد — دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذو الفقار حیدر نازد — کونین بذات پاک اکبر نازد

(ماخوذ از شعرالعجم - حیات صالح - اورنٹیل بیا گرفیکل ڈکشنری مولفہ ہنری جارج کین)12

نوٹ نمبر 4۔ ہسٹری آف جہانگیر۔ بادشاہ نامہ۔ مآثر الامرا۔12

نوٹ نمبر 5۔**علامہ افضل خان**۔ قبل اس کے کہ اس علامہ روزگار ہستی کے حالات پر روشنی ڈالوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اشتباہ کو جو رسالہ ''پیمانہ'' آگرہ بابتہ ستمبر 25 کے صفحہ 74 کے مطالعہ سے اس لائق و فائق شخصیت کے متعلق ہوتا ہے اور جس سے بساط سلطنت مغلیہ کا ایک مورد تحسین وتعریف وزیر فرزانہ پیادوں کی صف میں بھی کھڑے ہونے کا مستحق نہیں رہتا۔ رفع کردوں۔

کوئی صاحب ہشام میرٹھی ہیں جو اس تخت ولعل پر 11-12 سطروں میں روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔'' یہ بیش بہا جواہر شاہ عباس بادشاہ ایران نے اپنے ایلچی کے ذریعے سے جنت مکانی جہانگیر بادشاہ کو ہدیتاً بھیجا تھا۔ جب شاہجہاں نے دکن فتح کیا تو جہانگیر نے خوش ہو کر اس فتح کے صلہ میں اپنے غلام افضل خان کے ہاتھوں شاہجہاں کو عنایت کیا تھا۔''

کیا اس عبارت کو پڑھ کر کوئی سمجھ سکے گا کہ افضل خان وافضل خان ہیں جو علامی ابوالفضل کے بعد خطاب علامی کے مستحق ٹھہرے تھے۔ جن کے علم وفضل کی ہر چہار جانب دھوم تھی۔ جو دارالعلم شیراز کے مایۂ ناز فرزند اور شاہجہاں کے دیوان کل (وزیراعظم) تھے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ پڑھنے والا صرف یہ سمجھے گا کہ وہ شخص شاہی غلام تھا اور زیادہ سے زیادہ یہ خیال کرے گا کہ بڑا معتمد غلام تھا۔ جب ہی تو لاکھ روپیہ کا لعل بادشاہ نے اس کے ہاتھوں بھجوایا۔ معترز مضمون نگار نے کسی فارسی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے اور اس میں کوئی ایسا ہی ضمنی لفظ ہوگا۔ جیسا کہ پرانے انشاپرداز ملازمین و وابستگان دامن کے لیے لکھا کرتے تھے۔ مثلاً فدوی درگاہ بندۂ درگاہ وغیرہ وغیرہ جس کا ترجمہ آزادی سے کردیا گیا۔ اصل میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ترجمہ کرتے وقت وہ امتیازی خصوصیات ضرور مدِّ نظر رکھی جائیں جن سے کسی آدمی کی حیثیت پر اثر پڑتا ہو۔ خصوصاً تاریخی اور کسی خاص فن کے متعلق تراجم میں۔ تاریخ ایک ایسا راستہ ہے۔ جس کے دونوں طرف بڑے بڑے خوفناک غار اور کھڈ ہوتے ہیں۔ قدم چوکا، پاؤں کو لغزش ہوئی اور آدمی کہیں سے کہیں پہنچا۔ سرسری نظر ڈالنے سے بھی تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس زمانہ میں جبکہ آئین وآداب کی پابندی بڑی لازمی تھی اور تحف وعطایا مرسل الیہ کی حیثیت و وقعت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک حیثیت دار آدمی کے ہاتھ بھیجے جایا کرتے تھے۔ وہ باپ جو شہنشاہ ہند ہے اس بیٹے کو جس کے متعلق دادانے رودررو سفارشیں کی ہیں۔ مسند پر تخت کے برابر بٹھالا جاتا ہے۔ لائق ہے، فائق ہے، جس کی شمشیر خاراشگاف کا لوہا سارا

دکن مانے ہوئے ہے ایک غلام کے ہاتھ صلہ بھیجتا۔ معطی جہانگیر، عطیہ ایک قابل قدر نادر روزگار لعل ولی عہد سلطنت شاہجہاں کو اور حامل و بردندہ ایسی معمولی شخصیت۔ شاید لائق مضمون نگار نے آب حیات میں وہ واقعہ نہیں پڑھا جو میر تقی میر اور نواب سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ (المتوفی 1229ھ مطابق 1814) کے مابین گزرا۔ وھو ہذا۔

جب نواب آصف الدولہ (المتوفی 1212ھ مطابق 1797) کی وفات ہوئی۔ اور نواب سعادت علی خاں کا دور ہوا۔ تو میر صاحب دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ تحسین کی مسجد پر سرراہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا "انشا! یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی نہ دیا" عرض کی۔ "جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر اکثر حضور میں آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔" سعادت علی خاں نے آکر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا۔ اور کہا "مسجد میں بھجوا دیجئے یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔" سعادت علی خان جواب سن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشا (المتوفی 1233ھ) خلعت لے کر گئے اور اپنے طرز پر سمجھایا کہ "نہ اپنے حال پر بلکہ عیال پر رحم کیجیے اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے۔ اسے قبول فرمائیے"۔ میر صاحب نے کہا "صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف۔ میرے حال سے واقف اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپیہ کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔

دور کیوں جائیے مرزا نوشہ غالب (المتوفی 1869) کو لیجیے جنھوں نے مغلوں کا بگڑا ہوا دربار چند روز دیکھا تھا۔ ان کی آن بان کی یہ کیفیت ہے کہ یہ جس وقت 1842 میں دہلی کالج کی فارسی مدرسی کی ملازمت کرنے کے سلسلہ میں ٹامسن صاحب سے ملنے گئے ہیں۔ تو پالکی سے اتر کر اس انتظار میں کچھ دیر کھڑے رہے کہ صاحب استقبال کو تشریف لائیں تو اندر جائیں۔ انھیں پہنچنے میں دیر ہوئی اور صاحب کو وجہ بتلائی گئی۔ خیر وہ تشریف لائے اور کہا "مرزا صاحب! جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی حسب دستور تعظیم ہوگی۔ لیکن اس وقت جبکہ آپ نوکری کے لیے تشریف لائے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں۔" مرزا

صاحب نے فرمایا "سرکار کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کا اعزاز بھی گنواں بیٹھوں"۔ صاحب نے کہا "ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے کہ آن بان سے معذور تھے۔
(آب حیات و یادگار غالب)

جب ان لوگوں کی کہ مغل تہذیب کے پیرو تھے یہ کیفیت ہو تو ان ہستیوں کا جو واضعین تہذیب و آئین تھیں کیا کچھ عالم نہ ہوگا۔ سلطنت و معاملات سلطنت میں باپ ہو یا بیٹا۔ بھائی ہو یا بھتیجہ۔ جورو ہو یا بیٹی۔ سب کے ساتھ پابندی قواعد مقررہ برتی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ملا عبدالحمید مورخ شاہجہانی نے تو علامی لفظ بڑھا کر شک و شبہ کی گنجائش رکھی ہی نہیں۔

اب ملاحظہ ہوں حالات "علامی افضل خان":

علامی افضل خان۔ ملا شکر اللہ نام۔ افضل خان اور علامہ خطاب، علامی تخلص، باپ کا نام عبدالحق شیراز وطن تھا۔ سلطنت مغلیہ کے ان چند امرا میں سے ہیں۔ جنھوں نے محض اپنے علم و فضل کے باعث شہرت و عزت پائی۔ سلطنت مغلیہ میں صرف تین امرا کو علامی کا خطاب حاصل ہوا۔ (۱) علامی ابوالفضل (المتوفی 1011ھ) وزیر اکبر۔ (2) یہی ملا شکر اللہ علامی افضل خان اور (3) علامی سعد اللہ خان (المتوفی 1068ھ مطابق 1656) وزیر شاہجہاں۔ لطف یہ ہے کہ تینوں کی سوانح زندگی اٹھا کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک نے اپنی علمی قابلیت اور ذاتی لیاقت کی وجہ سے سب کچھ حاصل کیا۔

علامی افضل خاں شیراز سے اول بندر سورت میں آئے اور خان خاناں عبدالرحیم خان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔ بعدۂ شہزادہ خورم (شاہجہاں) کی ملازمت میں منسلک ہو کر میر عدل لشکر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دربار جہانگیری سے افضل خان کا خطاب عطا ہوا۔ شاہجہاں کے عہد میں پہلے میر سامان پھر علامی ہو کر دیوان کل (وزیر اعظم) ہوئے۔ "<u>شد فلاطوں وزیر اسکندر</u>" (1038ھ) تاریخ وزارت ہوئی۔ 11ج میں شاہجہاں نے ان کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت فرمایا۔ 12 رمضان 1048ھ کو 70 سال کی عمر میں بمقام لاہور انتقال کیا۔ کسی نے تاریخ کہی۔

<u>ز خوبی برد گوئے نیک نامی</u>

لاش آگرہ لا کر دفن کی گئی۔ ان کا مقبرہ "چینی کا روضہ" کہلاتا ہے اور خوب عمارت ہے۔ گویا بیٹے

(شاہجہاں) کا وزیر باپ (جہانگیر) کے وزیر (اعتماد الدولہ) سے کچھ ہی دور ہٹ کر جمنا کے اس پار خواب عدم کے مزے لے رہا ہے۔

علامہ موصوف جامع معقول ومنقول، خوش نویس، خوش گو، خوش فہم، اعلیٰ درجے کے شاعر اور انشاپرداز تھے۔ لیکن علم حساب سے انھیں فطری تنفر تھا اور بہت الجھتے تھے۔

لطیفہ۔ علامہ افضل خان چونکہ حساب کتاب سے بہت گھبراتے تھے۔ اس لیے اس کے متعلق انھوں نے تمام اختیارات اپنے پیش کار لالہ دیانت رائے ناگر گجراتی کے سپرد رکھے تھے۔ ہر بات کے لیے اسی سے دریافت کرلیا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان سے کچھ پوچھ بیٹھتا تو کہہ دیتے ''دیانت رائے سے پوچھو'' ان کے انتقال پر کسی نے ان کا مرثیہ کہا اور اس میں اس واقعے کی طرف اشارہ کر کے لکھا کہ فرشتوں نے قبر میں سوال کیے تو خان موصوف نے کہا ''از دیانت رائے بہ پرسید۔ جواب شما خواہد داد'' (افسوس ہے کہ میں نے اس مرثیہ کو بہت تلاش کیا لیکن دستیاب نہ ہوا۔ ورنہ ناظرین کے سامنے اصل اشعار پیش کرتا)

علامہ موصوف کی عالی ظرفی و وسیع الاخلاقی اس سے ظاہر ہے کہ باوجود 28 سال ملازمت کرنے اور صاحب اقتدار رہنے کے شاہجہاں کا بیان ہے کہ ''افضل خان کی زبان سے کبھی کسی کے حق میں برائی نہ سنی'' ان کا ماہر سیاسیات ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ شاہجہاں جیسے دانشمند اور مردم شناس بادشاہ نے ان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ دکن کے صدہا عقدے ان ہی کے ناخن تدبیر کے کھولے ہوئے تھے۔ علامہ موصوف لاولد تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے چھوٹے بھتیجے عنایت اللہ خاں کو متبنیٰ کرلیا تھا۔ علم دوست، شریف نواز، اور قدردان بادشاہ نے ان کی وفات کے بعد اس کو ایک عقلمند کی نشانی سمجھ کر عاقل خاں کے خطاب سے معزز و ممتاز کیا تھا۔

(قاموس المشاہیر بمأثر الامراء اور سیر المتاخرین)-12

نوٹ نمبر 6۔ سیر و بادشاہ نامہ۔12

نوٹ نمبر 7۔ تاریخ ہند اسمتھ۔ بادشاہ نامہ۔ سیر۔ ماثر الامرا۔

نوٹ نمبر 8۔ ماثر۔ بادشاہ نامہ۔ تاریخ ہند اسمتھ۔12

ایک خاص ستارہ

تکیہ گاہ کے درمیانی اُبھرے ہوئے حصے کے عین وسط میں ایک ہیرے کا ستارہ لگا ہوا تھا۔ جس کی

شعاعیں چاروں طرف پھیل کر عالم برق پیدا کرتی اور تماشائی کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھیں۔ یہ ستارہ ایسی ترکیب کے ساتھ بنایا گیا تھا کہ اس کو گھمایا بھی جا سکتا تھا1۔

نوٹ نمبر 1 - پرشیا اینڈ دی پرشین کوئچن ۔12

چھت

گنبد نما چھت (خالص کندن کی اندر سے بیشتر مینا کار اور کہیں کہیں موزونیت کے ساتھ مرصع، خصوصاً باہر کی طرف لعل، یاقوت، الماس اور مختلف الاقسام رنگارنگ جواہرات سے مغرق1، جا بجا گوہر ناسفتہ (جن میں سے ہر ایک کا وزن 9 سے 12 رتی تک تھا2۔) تاباں و درخشاں، حاشیہ میں پر تکلف مدور صراحی دار مروارید کی جھالر لگی ہوئی۔ موقع بموقع موتیوں کی لڑیوں کے حلقے بنے ہوئے جن میں اسلحۂ سلطانی مثل گرز، شمشیر، تیر، کمان اور سپر وغیرہ کے آویزاں رہتے تھے3۔ درمیان میں ایک بہت بڑا صاف و شفاف بیش قیمت پتھر جس سے نظر وار پار ہو سکے، 260 گرین کے وزن کا لعل و نیلم سے گھڑا ہوا اس طرح آویزاں تھا کہ تخت پر جلوس کرنے والے کی نظر کے سامنے رہے4) بارہ زمردیں5 ستونوں اور جڑاؤ محرابوں پر قائم تھی6۔ درمیانی محراب پر ایک طلائی درخت تعبیہ تھا۔ جس میں نادرہ کار صناعوں نے لعل، یاقوت، زمرد وغیرہ جواہرات کے پھل، پھول اور پتے بنا کر داد صنعت و دستکاری دی تھی7۔ حق تو یہ ہے کہ یہ درخت انسانی موشگافی و دقیقہ رسی کا جیتا جاگتا معجزہ تھا۔ اس درخت کے ادھر اُدھر دو نظیری مرصع طاؤس دم پھیلائے کھڑے تھے6۔

نوٹ نمبر 1۔ بادشاہ نامہ وظفر نامہ شاہجہاں ۔12

نوٹ نمبر 2 - بڑی جنتری بابتہ 1894 قسط سوم تاریخ ہند۔ 12

نوٹ نمبر 3 - 5 - حواشی سوانح اورنگ زیب مصنفہ لین پول ترجمہ لطیف احمد بی۔ اے

نوٹ نمبر 4 - پرشیا اینڈ دی پرشین کوئچن ۔12

نوٹ نمبر 6 - "لارڈ کرزن" نے "پرشیا اینڈ دی پرشین کوئچن" میں ٹیورنیر کی سند پر ستونوں کی تعداد چار لکھی ہے اور بابو ایشوری پرشاد صاحب کی تاریخ ہند میں دی ہوئی تصویر "شاہجہاں بر تخت طاؤس" سے بھی اسی

کی تائید ہوتی ہے۔ مگر صاحب بادشاہ نامہ اور مورخین قدیم نے 12 ستون لکھے ہیں۔ ٹیورنیر کے بیان کے مطابق ستون ملبوس دُرر تھے اوران میں تعبیہ شدہ موتیوں میں سے ہرایک کاوزن 24 سے 40 گرین تک تھا۔

نوٹ نمبر 7-8 ''قصص ہند'' آزاد مرحوم۔

موروں کی تعداد اور اختلاف مورخین

ان موروں کی تعداد اور محل وقوع کے متعلق مورخین میں بہت اختلاف ہے تاریخ ہندوستان منشورہ مالکان بڑی جنتری، سوانح اورنگ زیب مصنفہ لین پول، صاحب چیمبرس انسائکلو پیڈیا (مطبوعہ ''لندن'') اور ٹیورنیر کے بیانات سے ایک مور ثابت ہوتا ہے اور دو گلدستے، لیکن مرتب انسائیکلو پیڈیا آف برٹانکا، مورخ شاہجہانی، مولوی ذکاء اللہ، صاحب ماثر الامرا اور ڈاکٹر برنیر وغیرہم دو۔ دو مور اور ایک ایک درخت بیان کرتے ہیں اور یہی قول مستند معلوم ہوتا ہے۔

شاہجہاں کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے بھی ایک مور کا ہونا ناممکن کیونکہ اسے ہر چیز میں جواب کا التزام تھا۔ چنانچہ اس کی بنوائی ہوئی کوئی عمارت اس شان سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ تاج محل آگرہ میں اس نے ایک مسجد بنوائی تو دوسری جانب اس کے مثل ایک مسجد بے سمت بنوا کر تسبیح خانہ کے نام سے موسوم کی۔

ہماری اس رائے پر ایک اعتراض ہوسکتا ہے کہ ٹیورنیر کے بیان کے موافق (''چتر کے اوپر ایک طلائی طاؤس دم پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی دم فیروزوں اور جواہرات سے جڑی ہوئی تھی۔ طاؤس کے دونوں طرف طلائی پھولوں کے گلدستے تھے اُن میں بھی قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے 1'') بھی ذوق شاہجہانی کو صدمہ نہیں پہنچتا کیونکہ اِدھر اُدھر گلدستے اور بیچ میں مور۔

اس اعتراض کا جواب ایک تو عقلی ہے۔ وہ یہ کہ کیا عجب ہے کہ ٹیورنیر لکھنا چاہتا ہو۔ ''دو مور اور ایک گلدستہ'' مگر سہواً لکھ گیا ہو اس کے برعکس اور دوسرے اس کے بیان کو اپنا ماخذ قرار دے کر غلط فہمی میں پڑ گئے ہوں۔ دوسرا نقلی کہ صاحب بادشاہ نامہ جو مورخ شاہجہانی تھا لکھا ہے:

''ومقرر شد کہ سقف آں راز درون بیشتر مینا کارو لختے مرصع واز بیرون بہ لعل و یاقوت و

جز آں مرصع مغرق ساختہ بر زمردیں اساطین دوازدہ گانہ برافراز دو بالائے آں دو پیکر طاؤس مکلل بہ جواہر ز واہر و درمیان ہر دو طاؤس درختے مرصع بہ لعل والماس و زمرد و مروارید تعبیہ کند"

اس کا بیان سب سے زیادہ موثق ہے۔ کیونکہ اس کا کام ہی شاہی تاریخ نویسی تھا۔ یہ کوئی مذہبی یا سیاسی مسئلہ بھی نہیں ہے جو اس نے بادشاہ کے خوف یا اپنے خیالات سے اس میں تغیر و حذف سے کام لیا ہو۔ مورخ مذکور ہی کے بیان سے اخذ کر کے یا خود دیکھ کر خافی خان اور ڈاکٹر برنیر وغیرہم نے دو مور لکھے ہیں 2 اور یہی صحیح ہے اس کے علاوہ نقل کو عقل پر فضیلت بھی ہے۔

نوٹ نمبر 1۔ سوانح اورنگ زیب مصنفہ لین پول و مترجمہ لطیف احمد بی۔اے۔12

نوٹ نمبر 2۔ ماثر الامرا۔ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر۔12

محل وقوع طواویس

یہ بحث تو تھی تعداد طواویس کے متعلق، اب رہا مسئلہ محل وقوع طواویس۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ تکیہ گاہ پر تھے۔ 1 مگر خافی خاں، ملا عبدالحمید لاہوری اور برنیر چھت پر بیان کرتے ہیں۔ اور یہی قرین قیاس ہے۔ ہم مولانا آزاد دہلوی کی رائے کے موید ہیں۔ جو ان سے ماخوذ اور یہ ہے:

روکار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا.......... اِدھر اُدھر اس کے دو مور...... کھڑے تھے 2۔

نوٹ نمبر 1 - بک آف نالج -12 نوٹ نمبر 2- قصص ہند۔12

کیفیت طواویس

صناع نے ان ہر دو طاؤسان طلائی کو ایسی خوب صورتی سے دم پھیلائے ہوئے بنایا تھا کہ آمادہ رقص معلوم ہوتے تھے 1۔ اور ان کی دُموں میں اس خوش اسلوبی و حسن ترتیب سے نیلم، زمرد، فیروزے اور دوسرے جواہرات تعبیہ کیے تھے۔ کہ دُم طاؤس کا اصلی مذاق نمایاں تھا۔ ہر ایک کی چونچ میں سڈول اور یکساں موتیوں کی تسبیح پڑی ہوئی۔ سینے پر ایک ایک بیش قیمت لعل جڑا

ہوا۔ جس کے گرداگرد دو دو سو گرین کے وزنی موتی جڑے ہوئے تھے، گلے میں 63-63 رتی موتیوں کا ہار ایک نورانی ہیرے سمیت (جس کا وزن 117 رتی تھا) آب وتاب کے ساتھ آویزاں تھا۔

نوٹ نمبر 1- قصص ہند- 12

نوٹ نمبر 2- پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن - 12

ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید

اس موقع پر ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید کرنی بے محل اور خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ وہ تخت مذکور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مگر اس کی ساخت اور کاریگری ان جواہرات کے ہم پلہ نہیں ہے۔ البتہ دو مور جو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں۔ بہت ہی عمدہ نقشے پر بنے ہیں۔ اور ان کو ایک صناع نے جس کی کاریگری اور ہنرمندی حیرت کے لائق تھی اور جو اصل میں فرانس کا رہنے والا تھا (اور جس نے یورپ کے بہت سے رئیسوں کو جھوٹے جواہرات دے دے کر جن کو وہ ایک خاص حکمت سے تیار کرتا تھا۔ خوب الٹا تھا اور پھر بھاگ کر شہنشاہ مغل کے یہاں پناہ آن لی تھی۔ اور یہاں بھی خوب دولت کمائی تھی) بنایا تھا1''۔

ڈاکٹر مذکور کے مسطورہ بالا بیان سے امور ذیل مستنبط ہوتے ہیں

(1) تخت طاؤس بذات خود کچھ زیادہ خوب صورت نہ تھا اور نہ اس کی صنعت لائق داد تھی۔ بلکہ صرف اس کے جواہرات قابل قدر تھے۔

(2) اس تخت کو محض ایشیائیوں نے نہیں بنایا تھا۔ بلکہ ایک فرانسیسی بھی اس کے بنانے میں شریک تھا۔

(3) مور اسی فرانسیسی ہی کے بنائے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے وہ بے حد خوب صورت تھے۔

(4) ہندستانی وایشیائی صنعت وقیع نہیں۔

پہلے امر کے متعلق تو ہم یہ کہیں گے کہ قطعی غلط بقول ڈاکٹر ایشوری پرشاد (جو عہد حاضرہ

کے مشہور و مسلم الثبوت مورخ صاحب تصانیف کثیرہ اور جامعۂ (یونیورسٹی) الہ آباد کے شعبۂ تاریخ کے ایک نمایاں و سربرآوردہ رکن ہیں) اس تخت کی تعریف عہد مغلیہ کے سفرائے اروپا (یورپ) نے بڑے شدومد کے ساتھ کی ہے 3"۔ اگر وہ ایشیائی مذاق سے ناآشنائی کی بنا پر یا اپنی عادت کے موافق کہ ایشیائیوں اور خصوصاً ہندستانیوں اور ان کی ہر ہر شے کا مذاق اڑانے کے لیے ہر وقت اور ہر موقع پر اُدھار کھائے ہوئے ہے۔ ایسا کہتا ہے تو تعجب نہیں۔ حیرت تو اس وقت ہوتی جب وہ ایسا نہ کرتا۔ کیونکہ یہ اس کی عادت کے خلاف ہوتا۔ پھر اس کے زمانہ کا یورپ آج کل کا ساصناع و دستکار اور ہر خطہ دنیا کے مذاق کا واقف و نباض نہ تھا اور جواہر تراشی میں خصوصاً فرانس، اس لیے بھی بیچارہ ڈاکٹر قابل عفو اور اس کی تحریر لائق چشم پوشی ہے۔

دوسرے اور تیسرے امر کی مخالفت ہم علی الاعلان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ محض ڈاکٹر مذکور کا جذبۂ وطن پرستی ہے۔ جو ایسا لکھوا رہا ہے۔ ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اس موقع پر ہمیں اپنے یہاں کی تواریخ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ہمارے یہاں کے مورخین نے جو عادتاً کبھی کسی کی صنعت و دست کاری پر خاک نہیں ڈالتے۔ اس طرف اشارہ و کنایہ سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ بڑی شدومد کے ساتھ لکھتے۔ کیونکہ جب کبھی کسی غیر ملک یا غیر مذہب کے آدمی نے کوئی معمولی سا کام بھی کیا ہے تو انھوں نے بالتصریح لکھا ہے۔ مثلاً کوہ نور 4 کو ایک وینس کے باشندے ہارٹینلو بارگس نے تراشا ہے۔ وہ بے تکلف لکھ رہے ہیں 5۔ معماران تاج محل کے ذیل میں ملکی ہندو مسلمانوں کے ساتھ ایک رومی کا نام بھی بے دریغ تحریر کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو خواہ مخواہ یورپ کے ساتھ کہیں بطور شک اور کہیں بطور یقین اپنی خوش عقیدگی کا اظہار کر گئے ہیں اور اپنی ملکی صناعی کو ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ جیسا کہ سرسید مرحوم نے توزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ میں جہاں جہانگیر نے ایک مسلمان ایشیائی کی ساختہ ہاتھی دانت کی ان چار نادر و نایاب تصاویر کا تذکرہ کیا ہے جو ایک پستہ کے چھلکے میں سماجاتی تھیں اور جن میں سے ہر ایک بطور خود ایک مرقع

تھی۔اُس تصویر کا بیان پڑھ کر جس میں ایک درخت ہے۔ درخت کے نیچے حضرت عیسیٰؑ بیٹھے ہیں۔ایک آدمی آنحضرتؐ کے پاؤں چوم رہا ہے۔وہ ایک پیر مرد سے باتیں کر رہے ہیں۔چار شخص اور آس پاس کھڑے ہیں تحریر کیا ہے۔

ساختن تصویر حضرت عیسیٰؑ را وجہے معلوم نمی شود۔ غالباً ایں کارنامہ از کارنامہائے کاریگران فرنگ بودہ وبدستش افتادہ آں را از کارنامہ خودنذر گزرانید۔

یا سید صاحب مرحوم ہی نے شاہ نشین دیوان عام قلعہ دہلی میں بنی ہوئی تصاویر کا بیان آثارالصنادید میں کرتے ہوئے مرقع سرود 6 آرفیوس کا ذکر کیا اور تحریر فرمایا ہے:

جو کہ اس مرقع کا فرنگستان کے سوا اور کہیں رواج نہیں تھا۔اس لیے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی اٹلی کا رہنے والا فرنگی شریک تھا۔''

حالانکہ بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم'' اس زمانہ میں یورپ یہ یورپ نہ تھا۔ مسلمان انبیائے بنی اسرائیل سے ناآشنا نہ تھے کہ ان کے لیے (اس اول الذکر مرقع میں) حضرت عیسیٰؑ کی تصویر بنانا دشوار و تعجب انگیز ہوتا خصوصاً جبکہ اکبر کے دربار میں عیسائیوں کے دخل پانے سے حضرت عیسٰیؑ اور حضرت مریم علیہم السلام کی تصاویر عام ہو چکی ہوں، اور دیوان عام کے شہ نشین والی تصویر کے متعلق بھی یہ امر آسانی سے واضح ہو جاتا ہے کہ یورپ کے سلاطین سلاطین مغلیہ کو عام طور پر تحف و ہدایا بھیجتے رہتے تھے۔ان کی قدر دانی اور مصوری کی خوش مذاقی سے آگاہ ہو کر کسی بادشاہ نے اپنے ملک کی پسندیدہ و مقبول عام تصویر'' مرقع سرود آرفیوس'' بھی بھیجی ہوگی۔ بادشاہوں میں سے کسی نے بہت پسند کی ہوگی یا اس نے پسند عام کا خلعت پہنا ہوگا اور خود بادشاہ کے اشارے یا کاریگروں کی مزاج شناسی و نظر بازی نے سر دربار لا کر لگا دی ہوگی۔

پس یہ کیسے ممکن تھا کہ اس تخت اور خصوصاً ان عجوبۂ روزگار طوا ویس کے بنانے میں کوئی یورپین کاریگر شریک ہوتا یا قطعی وہی بناتا اور وہ نہ لکھتے۔جس طرح بقول صاحب ارضِ تاج (واحد یار خاں بی اے اکبر آبادی، مدیر''نئی روشنی'') یورپین قوم میں تاج محل کی خوبی سے متاثر ہو کر روایتیں گڑھ گڑھ کر چاہتی ہیں کہ اس کے معمار ہی بننے کی عزت حاصل کر لیں' اسی طرح ڈاکٹر برنیر بھی

یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تخت طاؤس کی ساخت وخوب صورتی کو ممنون صنعت فرانسہ بنا کر حب الوطنی کی داد دے۔ ہمارے خیال میں تخت طاؤس۔کیکئی یتر (केकयी यंत्र) نامی قصص الاصنامی خیالی یا واقعی تخت کے تخیل کی ویسی ہی حقیقی شکل تھا جیسی بقول واحد یار خاں صاحب ''تاج'' مقبرۂ ہمایوں کے ابتدائی خیال کے حد وانتہا ہے۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اگر کوئی مغربی تخت طاؤس کے بنانے میں شریک ہوتا۔ تو ٹیورنیر جو بقول سرکار9 ڈاکٹر مذکور کا خوشہ چیں10 اور ہماری رائے میں اسی کی طرح جذبۂ وطن پرستی سے مملو تھا۔ وہ اس امر کی توضیح کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ ہمیں سرکار ممدوح کی رائے پر کہ ''خاص امرائے دربار نے جو لکھا وہ زیادہ قابل تسلیم ہے11'' عمل کرنا اور اس امر کو بایں وجہ کہ خود مورخ شاہی نے ایسا نہیں لکھا غلط سمجھنا چاہیے۔

چوتھا امر بھی قطعی خلاف واقعہ ہے۔ ایشیا خصوصاً ہندستانیوں کی صنعت و دستکاری زمانہ قدیم سے ضرب المثل رہی ہے اور انھوں نے اپنے حیرت انگیز صنعتی کارناموں سے دنیا کو انگشت بدنداں بنا دیا ہے۔ جو اس دعوے کی دلیل قطعی ہے۔ خود ڈاکٹر موصوف کا یہ قول ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کا مصداق ہے۔

''دہلی میں ہنر مند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں۔ مگر اس کا یہ سبب نہیں کہ ہندستانی لوگ صنائی اور کاریگری کی قابلیت نہیں رکھتے کیونکہ ہندوستان کے ہر ایک حصے میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوب صورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنھوں نے شاید کسی استاد سے تعلیم نہیں پائی ہوتی۔ بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسے کامل طور سے تقلید کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیا کے نہایت عمدہ شکاری بندوقیں ہیں اور سونے کے زیورات تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یوروپین سناران سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔ مصوری ونقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر میں اکثر حیرت میں آ گیا ہوں جلال الدین محمد اکبر کی بڑی مہموں کی ایک شبیہ جو ایک مشہور اور نامی مصور نے ایک ڈھال پر سات

برس کے عرصہ میں تیار کی تھی۔ اس نے تو بالتخصیص مجھ کو حیران کر دیا اور میں نے اس کو ایک عجیب کام خیال کیا۔"12

نوٹ نمبر 1- وقائع سیاحت برنیر۔12

نوٹ نمبر 2- ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب ایم۔اے یہ صاحب الہ آباد یونیورسٹی کالج میں شعبہ تاریخ کے ہسٹری ریڈر ہیں۔ بہت ہی قابل آدمی ہیں۔ انھوں نے اردو ہندی میں ایک سلسلہ تاریخ لکھا ہے جو انگریزی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ ان کی مشہور تاریخی تصنیف "مڈیول انڈیا" ہے۔ یہ ایک محقق مورخ ہیں۔

نوٹ نمبر 3- تاریخ ہند ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔12

نوٹ نمبر 4- کوہ نور۔ بلا اضافت بمعنی "نور کا پہاڑ۔ گولکنڈہ (دکن) سے برآمد شدہ ایک مشہور و معروف ہیرا جس کی ابتدائی تاریخ پردہ خفا میں ہے۔ ہنود روایات کے مطابق یہ ہیرا انگ دیش (   ) کے راجہ کے قبضہ میں تھا۔ جس کا عہد سلطنت تین ہزار سال قبل مسیح گزرا ہے۔ یہ راجہ "جنگ مہابھارت" میں شریک تھا۔ ایرانی روایات بتلاتی ہیں کہ وہ توران کے بادشاہ افراسیاب کے پاس تھا۔ لیکن منظر عام پر 1304 سے آیا ہے۔ جبکہ راجہ مالوہ کی شکست کے بعد علاء الدین خلجی کے ہاتھ لگا۔ اور یہیں سے اس کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ تاہم دوسو بائیس برس تک اس کے تاریخی حال پر اس کے بعد بھی پردہ پڑا رہا اور 1526 میں وہ قطعی طور پر بے نقاب ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا۔ جبکہ سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد اس کی ماں نے اسے بابر کی نذر کیا اور شاہجہاں کے دور سے وہ بڑی شد و مد کے ساتھ صفحات تاریخ پر ضوفگن ہے۔ اور غالبًا یہ نام بھی اس نے اسی بامذاق بادشاہ کے حضور سے پایا ہے۔ شاہجہاں نے ہارٹینسلو بارگس نامی ایک جواہر تراش سے جو وینس کا باشندہ تھا اس کو ترشوایا اور اس کی غلطی سے اس کا بہت سا حصہ ضائع ہو کر اس کا وزن ½186 قیراط رہ گیا۔ جس کے تاوان میں شاہجہاں نے اس سے دس ہزار روپیہ وصول کیا۔

کوہ نور وضع قطع میں گلاب کے پھول کے مشابہ تھا۔ اس پر مسلسل سطوح بغیر کسی ابھار کے نمایاں تھیں۔ اس کو بالکل مرغی کے نصف تو کدار انڈے کی مانند تصور کرنا چاہیے 1739 تک یعنی دوسو تیرہ سال یہ مغلوں کے قبضہ میں رہا۔ اور بعدہٗ اسی سنہ میں نادر شاہ بادشاہ ایران اسے لوٹ کر ایران لے گیا۔ نادر کے قتل کے

بعد 1747 میں وہ اس کے بھتیجہ علی عادل شاہ کے قبضہ میں پہنچا اور اس کی معزولی کے بعد نادر کے پوتے شاہرخ مرزا کے تصرف میں آ گیا۔ جس نے 1751 میں احمد شاہ ابدالی کے سپرد کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ 1800 میں شاہ شجاع والی کابل کے پاس پہنچا اور جب شاہ شجاع کابل سے بھاگ کر راجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب کے یہاں پناہ گزین ہوا۔ تو راجۂ موصوف نے یکم جون 1833 میں اس کو مجبور کر کے اس ہیرے کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور 1849 تک یہ اس خاندان کے حیطۂ تصرف میں رہا اور رانی چاند کنور کے حکومت برطانیہ سے برسر معرکہ ہونے اور شکست پانے پر لارڈ ڈلہوزی کے مقرر کردہ بورڈ کے قبضہ میں پہنچا۔ اس بورڈ نے اس ہیرے کو لارڈ لارنس کے حوالہ کیا جو اس زمانہ میں سرجان اور نیس کے نام سے ناخدائے کشتیٔ پنجاب تھے اور انھوں نے پھر لارڈ ڈلہوزی ہی کے ہاتھ اسے بمبئی بھیجا۔ لارڈ ڈلہوزی نے بہ نفس نفیس خود بمبئی پہنچ کر مجلس منتظمہ سرکار کمپنی کے حوالہ کیا اور 3 جولائی 1850 کو اسے ڈائرکٹران کمپنی کے وائس چیئر مین نے ہدیتاً ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصرۂ ہند مرحومہ کے نذر کر دیا اور اس وقت سے کوہ نور تاج برطانیہ کے جواہرات کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ 1851 میں یہ لندن کی عظیم الشان نمائش میں رکھا گیا اور 1852 میں امسٹرڈم کے مشہور جواہر تراش میسرز کاسٹر اینڈ کو کے یہاں مکرر ترشوایا گیا۔ جہاں اس کمپنی کے مشہور و معروف نگینہ تراش سنگر نامی نے اس کو 38 دن 12 گھنٹہ میں مختلف پہلوؤں سے تراش کر بیضاوی شکل میں منتقل کر دیا۔ اور اس کا وزن ½186 قیراط سے ½106 قیراط رہ گیا۔ اس مرتبہ تراشنے کے بعد اس میں اگلی سی تاب و تابش نہ رہی۔ اس لیے سر ڈیوڈ بریوسٹر اور پروفیسر میٹلمانٹ نامی ماہرین علوم کیمیا نے اس کی چمک دمک میں اضافہ کرنے کے متعلق بہت ہی دلچسپ تجربے کیے۔ حضور قیصرۂ مرحومہ نے اس ہیرے کو اپنی بہو یعنی ہمارے ملک معظم کی مرحومہ والدہ ماجدہ علیا حضرت کوئن الگزینڈرا کو بطور ترکہ مرحمت فرما دیا تھا۔

بڑی جنتری کے مرتب کے بیان کے موافق یہ ہیرا ملک شہنشاہ انگلستان کے تاج میں تعبیہ ہے اور شاہجہاں کے زمانہ میں اس کی قیمت 87 لاکھ پندرہ ہزار پانچ سو پچیس روپیہ آنکی گئی تھی۔

اس ہیرے کا ایک نمونہ (Model) ٹاور آف لنڈن اور ایک نمونہ عجائب خانۂ لاہور کی آرٹ گیلری میں رکھا ہوا ہے۔ یہ مختلف فرمانرواؤں کے پاس گردش کرنے اور تاریخی ہیرا ہونے کے باعث دنیا بھر کے ہیروں پر سبقت لے گیا ہے۔ اکثر لوگ اس کی نحوست کے قائل ہیں۔ چنانچہ لیڈی برٹن کا مقولہ ہے۔ "یہ نہایت بدشگون ہیرا ہے جس کے پاس رہا تباہی لایا"۔ مگر یہ خیال ہی خیال ہے۔ (اتخاذ از مضمون خود "الماس" ایجوکیشنل گزٹ

فروری 1925ء ''ہمدم'' اخبار لکھنؤ 14 ستمبر 1926ء بڑی جنتری 1894)

نوٹ نمبر 5۔ اقتباس از مضمون خود'' الماس'' جو جنوری فروری نمبر بابتہ سال 1925 میں'' ایجوکیشنل گزٹ'' لکھنؤ میں شائع ہوا۔ 12

نوٹ نمبر 6۔ سرسید۔ سید احمد خان نام، جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب بہادر شاہ شاہ دہلی کے حضور سے اور سر، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب برٹش گورنمنٹ سے اور ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ایڈنبرا یونیورسٹی سے ملی تھی۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ 18 اکتوبر 1817 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہادر شاہ آخری بادشاہ دہلی کی ملازمت میں آ گئے۔ کیونکہ ان کے آبا و اجداد وابستہ دامن دولت مغلیہ تھے۔ مگر از راہ دور اندیشی کچھ ہی دن کے بعد انگریزی سرکاری نوکری کر لی اور سب جج کے عہدے تک پہنچے۔ ارکان خمسہ اردو میں شمار ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے بانی اور بہت بڑے مصنف تھے۔ فن تاریخ سے علی الخصوص ان کو مذاق خاص تھا۔ آئین اکبری کی تصحیح کی۔ توزک جہانگیری طبع کرائی۔ تاریخ بجنور، رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ تاریخ سرکشی بجنور، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن اور آثار الصنادید ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ آثار الصنادید کو انھوں نے 1847 میں تصنیف کیا جو عمارت و مشاہیر دہلی کے حالات پر مشتمل ہے طرز تحریر پرانے ڈھنگ کا ہے۔ مگر معتبر تاریخ ہے۔ سرسید نے 27 مارچ 1898 کو بمقام علی گڑھ وفات پائی اور کالج کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی بعد کی تصنیفات کی زبان بہت شستہ ہے۔ ان کے اخلاق کے متعلق مسٹر بک کا قول نقل کر دینا کافی ہوگا۔ انھوں نے موصوف کے انتقال کے بعد لکھا'' گو ان کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں۔ مگر اخلاق ان سے بھی بڑھے چڑھے تھے''
(گل دستہ ادب اور سیر المصنفین)

نوٹ نمبر 7۔ یہ تصویر ملک اٹلی کے رہنے والے ارفیوس نامی ایک کلاونت کی ہے۔ جس کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سے مست ہو کر اس کے گرد آن بیٹھتے تھے اور اس کہانی کے موافق اسی ملک کے رہنے والے رفیل نامی ایک مصوّر نے جو اس فن میں بے مثل تھا۔ اپنے خیال سے ارفیوس کے گانے کا ایک مرقع کھینچا تھا۔ یہ مصوّر 1520 میں مرا۔ مگر اس کا یہ مرقع اور فرنگستانی ملکوں میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں فلسفۂ ہم خیالی پر نظر کرتے ہوئے وقائع ولنوری پر نظر ڈالیے۔

نوٹ نمبر8—علامہ شبلی۔شبلی نام،نعمانی خود کو امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب کر کے لکھتے تھے۔ شمس العلما خطاب تھا۔موصوف نے 1857 میں بندول نامی گاؤں میں جو ضلع اعظم گڑھ میں ہے پیدا ہوئے۔ غازی پور اور سہارنپور وغیرہ میں علوم رسمیہ عربی وفارسی کی تعلیم پائی حج کو گئے۔واپس آ کر وکالت کی۔یہ پیشہ طبیعت کے خلاف تھا لہٰذا چھوڑ کر ملازمت کی اور امین ہو گئے۔اس کو بھی خیر باد کہا۔اور 1882 میں علی گڈھ کالج کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔اسی زمانہ میں ترکی،مصر اور شام کا سفر کیا۔واپسی سفر پر گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا۔16 سالہ ملازمت کالج کے بعد کالج چھوڑ کر خانہ نشین ہو گئے۔چندروز کے بعد حیدرآباد میں ناظم علوم وفنون کے عہدے پر مامور ہوئے اور 4 برس تک وہاں رہنے کے بعد استعفیٰ دیا اور عرصہ تک لکھنو میں ندوۃ العلما کی خدمات انجام دیتے رہے۔18 نومبر 1914 میں وفات پائی۔حیدرآباد سے جو منصب مقرر ہوا تھا آخری وقت تک پاتے رہے۔مولانا شبلی فارسی واردو نظم ونثر پر قادر تھے ان کی سب سے بڑی شہرت کا باعث ان کی اردو کتب منشور ہیں آپ کو تاریخی تحقیقات کا بہت ذوق تھا اور عہد حاضرہ کے ترقی یافتہ طرز سیرت نگاری کے بانی اور ان مصنفین میں سے تھے جنھوں نے اردو طبقہ کو فن تنقید سے روشناس کرایا اور اردو میں داد تنقید دی آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔جن میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

سیرت نبوی۔شعر العجم۔موازنہ انیس ودبیر۔الفاروق۔المامون۔الغزالی۔سوانح مولانا روم۔ سفرنامہ شام وروم۔آپ کا طرز تحریر سلیس پر زور اور دل پذیر ہے۔(ماخوذ از سیر المصنفین اور گل دستہ ادب۔)12

نوٹ نمبر9—سرکار۔سر جادوناتھ سرکار ایم۔اے(ڈاکٹر) ہندوستان کے مشہور محقق مورخ۔ان کی تاریخیں چونکہ انھوں نے اہل دربار کی تحریروں سے بہت کچھ اخذ کر کے لکھا زیادہ مقبول ہوئیں۔''گریٹ مغل'' (تاریخ اکبر اعظم) اور ''اورنگ زیب'' یہ دونوں تاریخیں انگریزی زبان میں ہیں اور اچھی تاریخوں میں شمار ہوتی ہیں۔ولیم اروِن کی ''لیٹر مغل'' کو اس کی وفات کے بعد انھیں نے شائع کیا۔پہلے ہندو یونیورسٹی کالج کے ہسٹری پروفیسر تھے۔اب ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے رکن ہیں۔

نوٹ نمبر10-11 اورنگ زیب مصنفہ ڈاکٹر جادوناتھ سرکار

نوٹ نمبر12—وقائع سیاحت برنیر=12

وجہ تسمیہ تخت طاؤس

نام اور وضع کا خیال ہندو قصص الاصنام سے لیا گیا

ان طواویس ہی کی وجہ سے یہ تخت تخت طاؤس کے نام سے موسوم ہوا تھا1۔ میرے خیال میں اس تخت اور اس نام کا خیال ہنود کی اُن قدیم روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو بتلاتی ہیں کہ اسی نام کا ایک تخت ہندوستان کے عہد ماضی بعید میں بھی تھا۔ چنانچہ جین مت کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک راجہ مع اپنی رانی کے اس سبب سے کہ اس کے دیوان نے اس سے غدر و بیوفائی کی تھی۔ کیکئی ینتر (केकयी यंत्र) نامی تخت پر بیٹھ کر بھاگا۔ فضا میں پہنچ کر کسی خرابی کے باعث وہ تخت بگڑ گیا اور وہ دونوں ایک مرگھٹ پر گر کر مر گئے۔ لفظ کیکئی ینتر (केकयी यंत्र) ''سریر طاؤس نما'' یا ''تخت طاؤس'' کے ہم معنی ہے۔

نوٹ نمبر 1۔ٹوانیٹی ایتھ سنچری وبسٹر ڈکشنری اور انسائکلو پیڈیا برٹانکا=12

ہندوستان قدیم میں آلاتِ پرواز

اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان میں ''آلات پرواز'' ایجاد ہو چکے تھے اور اگر ایسا نہ تھا تو یہ ضرور تھا کہ قدیم اہل ہند کے خیالات اس قسم کی صنعت گری کی طرف تر کتاز اور پرواز ضرور کر رہے تھے۔ ورنہ یہاں کی دیومالا (مائی تھالوجی) میں یہ خیال ظاہر نہ کیا جاتا۔

ایک نقل

نقل کرتے ہیں کہ ''جس وقت بادشاہ تخت طاؤس پر جلوس کرتا تھا تو یہ مور دُم پھیلا کر ناچنے لگتے۔ تسبیح ان کی منقاروں میں گردش کرنے لگتی اور ''اللہ اللہ'' کی صدائیں چونچوں سے برآمد ہوتیں اور ہر صدا پر ایک دانہ ہٹتا جاتا تھا''۔ لیکن یہ نقل ہی نقل ہے اصل کو اس میں ذرہ بھر دخل نہیں۔ کہ.....ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے1

نوٹ نمبر 1۔ بڑی جنتری بابتہ 1894ء تاریخ ہند قسط سوم=12

سیڑھیاں

تخت پر چڑھنے کے لیے تین طلائی مرصع ومغرق بجواہرز واہر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں1۔

نوٹ نمبر 1- "ٹیورنیز" نے درمیانی محراب کے متعلق یہ اور لکھا ہے کہ اس میں ایک بیش قیمت، صاف اور شفاف جواہر آویزاں کیا گیا ہے کہ جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کے سامنے رہتا ہے۔ اس کا وزن 260 گرین کا ہے اور اس کے گرداگرد لعل ونیلم وغیرہ جڑے ہوئے ہیں۔

مصارف

تخت طاؤس کے مصارف کے متعلق بھی مورخین میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک علاوہ مشہور ومعروف جواہرات کے ایک کروڑ روپیہ اس پر صرف ہوا تھا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ کسی معتبر تاریخ میں ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔

جمہور مورخین قدیم اور ان سے مستنبط کرنے والے مورخین ماضی وحال مجموعی طور پر متفق ہیں کہ (حسب حساب مندرجہ صفحہ 136) وہ تمام جواہرات سمیت ایک کروڑ روپیہ میں تیار ہوا تھا۔

رسالہ "پیمانہ" آگرہ" بابت ستمبر 1925 میں ہشام صاحب میرٹھی کا ایک مضمون بعنوان "تخت طاؤس" نکلا تھا۔ اس میں ایک کروڑ گیارہ لاکھ روپیہ تخمینہ مصارف تھا۔ مگر وہ مضمون ساقط الاعتبار ہے۔ اس لیے میرے نزدیک یہ تخمینہ بھی قابل اعتبار نہیں۔

مسٹر لین پول اس کا تخمینہ مصارف دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "برنیر اور ٹیورنیر اس کی قیمت اور زائد بتلاتے ہیں1۔"

برنیر نے اپنے وقائع سیاحت کی دوسری جلد میں لکھا ہے۔ "چنانچہ اُس (شاہجہاں) کا ایک تخت ہی (اگر میری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو تو) تین کروڑ روپے کی لاگت کا ہے"۔

مسٹر بال نے زمانہ قدیم کے سکوں کی قیمتوں کو مروجۂ حال سکہ جات کی قیمتوں سے مقابلہ کر کے جو اس کی لاگت کا اندازہ کیا ہے، وہ ایک کروڑ پچاس لاکھ سینتیس ہزار پانچ سو (1,50,37,500) پونڈ (پونڈ کے بین الملی نرخ حاضرہ کے موافق بائیس کروڑ، پچیس لاکھ، باسٹھ

ہزار، پانچ سو روپیہ) ہے 2۔

مسٹر ای مارسڈن بی۔ اے نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے" ساڑھے چھ کروڑ (65,000,000) روپیہ اس پر خرچ ہوا تھا 3"۔ چونکہ صاحب موصوف کی درسی کتابوں میں اکثر امور کی بنا ضعیف روایات پر ہے۔ اس لیے میں اُن کی تحریر پر توجہ نہیں کرنا چاہتا۔

مشہور فرانسیسی سیاح و جوہری ٹیورنیر نے جواس تخت کی غائبانہ تعریف و توصیف سن کر اس کی دید کا مشتاق ہو کر ہندستان تک پہنچا تھا۔ اس کی قیمت کا اندازہ ساٹھ لاکھ (6000000) پونڈ (عہد حاضرہ کے نرخ کے مطابق نو کروڑ روپیہ) کیا تھا 4۔

ہم ٹیورنیر کے تخمینے سے اس بنا پر متفق ہیں کہ جمہور مورخین متاخرین جزوی اختلافات کے ساتھ اس کی رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے چلے آئے ہیں اور بغیر کسی قوی دلیل کے جمہور سے اختلاف کرنا ممدوح نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ایک اور وجہ بھی قول مذکور کی تائید کرتی ہے اور وہ یہ کہ عہد حاضرہ میں تاریخ نویسی کا جو طرز اختیار کیا گیا ہے یہ ہے کہ پہلے ہر امر کی کافی تحقیق تفتیش کر لی جائے۔ بعد ازاں اس کا اندراج تاریخ میں کیا جائے۔ جس کی دلیل تواریخ متقدمین کے بہت سے مندرجہ واقعات کا زمانہ موجودہ کی تاریخوں میں نہ پایا جانا ہے۔ پس یقین واثق ہے کہ مورخین دور موجودہ نے اس امر خاص میں بھی اپنے زمانہ کے طرز کو نظر انداز نہ کیا ہوگا۔

عہد حاضرہ کے بعض مورخین نے جواس تخت کے مصارف کا اندازہ سات کروڑ ساٹھ لاکھ (7,6000000) 5 یا آٹھ کروڑ (80000000) روپیہ کیا ہے۔ اس کا ماخذ بھی ٹیورنیر کا تخمینہ معلوم ہوتا ہے اور بظاہر وجہ اختلاف پونڈ کی قیمت کا وقتی تغیر۔ ایک اور تازہ شہادت ہماری رائے کی تائید مزید کرتی ہے اور وہ اخبار "فیلڈ" میں ایک سیاح کا شائع شدہ بیان ہے۔ جس نے حال ہی میں دوران سیاحت طہران سفیر دولت برطانیہ کے توسط سے شاہ پہلوی 6 شہنشاہ ایران کے محلات کے سیر کی عزت حاصل کی ہے۔ وہ اس تخت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اس کی قیمت کا اندازہ ستر لاکھ پونڈ کیا گیا تھا 7

7000000 (ستر لاکھ پونڈ) دس کروڑ پچاس ہزار روپیہ کے مساوی ہوتے ہیں اور یہ

رقم بھی ٹیور نیر اور مورخین مابعد کے تخمینوں کے لگ بھگ ہے۔

نوٹ نمبر 1- سوانح اورنگ زیب۔ مصنفہ مسٹر لین پول۔ مترجمہ مسٹر لطیف احمد صاحب بی۔اے

نوٹ نمبر 2- سفرنامہ برنیر۔ مترجمہ اے کانسٹیبل صاحب صفحہ 473۔ فٹ نوٹ نمبر 1

نوٹ نمبر 3- تاریخ ہند مصنفہ ای مارسڈن بی۔ اے۔ مترجمہ لالہ جیا رام و خلیفہ عماد الدین صاحبان۔ داستان ترکتازان ہند=12

نوٹ نمبر 4- مڈیول انڈیا مصنفہ لین پول=12

نوٹ نمبر 5- تاریخ ہند'' قسط سوم'' شائع شدہ بڑی جنتری 1894 اور رسالہ'' پیانہ'' آگرہ ستمبر 1925=12

نوٹ نمبر 6- شاہ پہلوی۔ رضا خان نام ایک ایرانی معمر و مدبر جنرل ہیں۔ جن کو اواخر 1925 میں ایرانی پارلیمنٹ نے خاندان قاچاریہ کے آخری حکمران ایران احمد شاہ کجکلاہ کے اعلان معزولی کے بعد عنان حکومت ایران تفویض کی اور موصوف 14- دسمبر 1925 کو اندرونی کشمکش کے دفعیہ کے بعد مستقل شہنشاہ ایران تسلیم کر لیے گئے۔ ممدوح چونکہ خاندان پہلوی کے رکن اور ایرانی قدیم حکمرانوں کی نسل سے ہیں۔ اس لیے آپ نے جلوس کے وقت اس نام کا اعلان کیا۔ اب تخت ایران نسلاً بعد نسل پہلوی خاندان کا ورثہ صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ہر دلعزیز، بیدار مغز، روشن خیال اور موجودہ طرز حکمرانی کے ماہر بادشاہ ہیں۔ سلطنت ایران آپ کے زیر سایہ تیزی کے ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔

نوٹ نمبر 7- '' آگرہ اخبار'' آگرہ مورخہ 7 نومبر 1928=12

تخت طاؤس

صلہ طلائی تھا یا اس پر سونے کا پتر منڈھا ہوا تھا؟

بعض مغربی مورخین اور سیاحوں نے کہیں شک اور کہیں یقین کے ساتھ تخت طاؤس کے کل یا جزو کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ صلہ طلائی نہ تھا۔ بلکہ اس پر سونے کا پتر منڈھا ہوا تھا۔ چنانچہ مسٹر لین پول نے سوانح اورنگ زیب کے حواشی میں ٹیورنیر کا یہ قول نقل کیا ہے:

''تخت پر سونے کا پتر جڑا تھا''

اور لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنی کتاب پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن میں اسی سیاح کا یہ بیان لکھا ہے:

''اوپر بنا ہوا مور جو تمام پکھراج کا بنا ہوا ہے دُم پھیلائے ہوئے ہے۔ اس کا جسم سونے کے پتر کا ہے''

برنیر اپنے وقائع سیاحت میں رقم طراز ہے:

''یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے۔ جن کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں''

مسٹر ولیم اردن 1 نے لیٹر مغل میں تحریر کیا ہے:

''تخت طاؤس سونے کے پتروں سے بنا ہوا تھا۔''

لیکن مورخین قدیم اور درباری تاریخ نگاروں کی تحریریں اس امر پر تبصرہ کرنے سے قطعی مجبور ہیں۔ مگر جب ہم اس کے طول، عرض، بلندی اور سونے کی مقدار پر نظر ڈالتے ہیں تو چونکہ سونے کی تھوڑی ہی سی مقدار وزنی و سنگین ہوتی ہے اور اس تخت میں صرف 31½ من سونا استعمال ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تو ہمیں اہل مغرب کی تحقیق صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور اوپر بیان کیے ہوئے مختلف اقوال کو مسلسل کرنے سے مندرجہ ذیل ترتیب ہمارے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

'مور مجوف اور پائے ٹھوس تھے۔ بقیہ اور سارے تخت پر دبیز پتر چڑھا ہوا تھا'

نوٹ نمبر 1 — ولیم اردن۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک وکیل کا بیٹا تھا۔ 5 رجولائی 1840 کو ابرڈین میں پیدا ہوا۔ بچپن میں لندن پہنچا۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ 15 سال کی عمر میں مدرسہ کو خیر باد کہہ کر دنیاوی عملی زندگی میں قدم رکھا۔ 19 سال کی عمر میں محکمۂ بحری میں ملازم ہو گیا۔ سال دو سال بعد چونکہ اس نے فرانسیسی و جرمنی زبان بخوبی سیکھ لی تھی۔ اس لیے مستعفی ہو کر کنگس کالج لندن میں تکمیل تعلیم کے لیے بھرتی ہوا۔ اور 1868 کے انڈین سول سروس کے امتحان میں اعلیٰ درجہ پر کامیاب ہو گیا۔

12 — دسمبر 1863 میں ہندوستان پہنچ کر سہارنپور میں اسسٹنٹ مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ اس کے بعد مظفر نگر تبدیل ہو گیا۔ 73-1872 میں اس نے دو سال کی رخصت لی اور یورپ کو واپس گیا۔ واپسی پر فرخ آباد کا

جنٹ (جوائنٹ) مجسٹریٹ معین ہوا۔ چونکہ تحقیقات تاریخ کا مذاق شروع عمر سے اس کی طبیعت میں موجود تھا اور تعیناتی ہوئی ایک تاریخی مقام پر اس لیے اس نے نوابان بنگش کی نہایت مستند و محققانہ تاریخ لکھ کر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ میں 79-1878 میں شائع کی۔ یہ تاریخ فرخ آباد ڈسٹرکٹ گزیٹیر مرتبہ مسٹر ایٹ کن سن شائع شدہ 1880 میں شامل کر لی گئی۔

ارون دوران ملازمت غازی پور میں زیادہ رہا۔ غازی پور میں وہ کلکٹر اور حاکم بندوبست تھا۔ یہاں کی تعیناتی کی یادگار اس نے ضلع غازی پور کے بندوست کی رپورٹ چھوڑی ہے۔ جو 1886 میں شائع ہوئی۔

اسے اپنی علمی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر ایک خاص مرتبے تک پہنچنا چاہیے تھا چونکہ خلاف امید ایسا نہ ہوا۔ اس لیے جوں ہی مدت ملازمت پنشن کے استحقاق تک پہنچی اس نے پنشن لے لی۔ 27 مارچ 1888 کو وہ سہارنپور واپس ہو کر پنشن پا گیا۔ گویا آغاز و انجام ملازمت سہارنپور میں ہوا۔ اس نے 25 سال ملازمت کی۔ جس میں سے پانچ سال رخصت پر رہا۔ پنشن کے وقت اس کی عمر 48 سال اور تندرستی بہت اچھی تھی۔ پنشن لینے کے بعد وہ انگلینڈ پہنچا۔ جہاں مدۃ العمر ادبی خدمات انجام دیتا رہا۔ وہ 1707 سے 1803 تک کی تاریخ ہندوستان زمانۂ اورنگ زیب سے لکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے فروری 1902 میں جادو ناتھ صاحب سرکار کو ایک خط میں لکھا تھا۔ ''میں 1707 سے 1803 تک ایک تاریخ لکھنا چاہتا ہوں۔ 1738 تک مسودہ کر چکا ہوں۔ 1759 تک میں نے ذخیرہ جمع کر لیا ہے'' اس کتاب کا نام اس نے لیٹر مغل (مغلان آخر) رکھا تھا۔ چونکہ وہ ہر ہر بات کو بے انتہا تحقیقات کرنے کے بعد لکھتا تھا۔ اس لیے اس کتاب کی تصنیف کا کام بہت آہستگی کے ساتھ ہوا۔ لیٹر مغل کا تھوڑا تھوڑا حصہ ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوتا رہا۔ یہ نامور محقق بجائے سو سال کے صرف 21 ہی سال کی تاریخ لکھ پایا تھا کہ اس کا جام زندگی لبریز ہو گیا اور اس نے جمعہ کے دن 3 نومبر 1911 کو ودیعت حیات مالک حقیقی کے سپرد کر دی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر 71 سال 4 ماہ کے قریب تھی۔ جس طرح گارڈنر کو اپنی تاریخ کے ختم نہ ہونے کا مرتے دم بہت صدمہ تھا۔ ویسا ہی اسے بھی تھا صرف اتنا فرق ہے کہ اس کو ایک لائق اور معتمد علیہ شاگرد میسر تھا اور یہ اس نعمت سے بھی محروم تھا۔ لیٹر مغل کو مسٹر سرکار نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ جس سے یقیناً اس کی روح بابو صاحب موصوف کی ممنون ہوئی ہوگی۔ اس نے جو یہ چاہا تھا کہ اس کی تاریخ قاموس التاریخ (ہسٹوریکل انسائیکلوپیڈیا) ہو۔ وہ نہ ہو سکا اور اس کے لیے کافی زمانہ کی ضرورت تھی۔

ولیم ارون انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبان کا ماہر تھا۔ اسے فارسی میں بھی کافی ملکہ تھا۔ فارسی زبان کو بخوبی سمجھ لیتا اور فارسی کی قلمی کتابوں کو بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ ہندی اور اردو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ہندوستان کی موجودگی ہی میں فارسی کی مطبوعہ و قلمی کتابوں کے علاوہ اردو ہندی کی کتابیں بھی جمع کر کے کافی ذخیرہ بہم پہنچا لیا تھا۔ وہ نہ صرف محقق بلکہ شیدائے تحقیقات تھا۔ اس کو جب کسی امر کی تحقیق مطلوب ہوتی یا وہ کوئی حوالہ دینا چاہتا تو یورپ، ایشیا اور امریکہ غرض ہر جگہ چھان بین کرتا تھا۔ اس کا طرز بیان سلیس، دلآویز منطقی اور قطعی نقطہ مقصودہ پر ہوتا تھا۔ اس کی تاریخ نویسی کے نمایاں اور مستحسن طریقوں میں یہ امور خصوصیت کے ساتھ قابل تذکرہ ہیں کہ اس نے ہمعصر اسناد سے صحیح تحقیق و استنباط کیا ہے۔ ہر چیز حوالہ جات کے ساتھ لکھی ہے۔ اس نے اس زمانہ کی فارسی تاریخوں، انگریزی، ڈچ اور پرتگالی سیاحوں کے سفر ناموں خطوط اور یادداشتوں اور عام تصنیفات، تالیفات اور فرامین سے اخذ کر کے اپنی کتاب ترتیب دی ہے۔ وہ قدرتی طور پر اور تعلیم کی وجہ سے اور شواہد پر تبصرہ کناں فیصلہ کرنے کا ایک خاص مادہ رکھتا تھا۔ اس کی تحقیق و تحریر میں وہ صحت و جامعیت ہے کہ المانیین (باشندگان جرمن) کو بھی میسر نہ آئی۔ اس کی تاریخ نویسی، اعلیٰ تاریخ نویسی کی مثال اور قابل تقلید ہے۔ مسٹر سرکار اس کے متعلق دیباچہ لیٹر مغل میں لکھتے ہیں۔ ''ہندوستان کے مورخین اور طلاب تاریخ کو لیٹر مغل کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ ان کو تاریخ نویسی کا طریقہ سکھلائے اور نظام دماغی کی تعلیم دے۔ مورخین کو چاہیے کہ وہ لیٹر مغل کو اپنا نمونہ بنائیں اور اسی طرح پر لکھیں''۔ ارون کے متعلق اس نامور مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اس کو لوگ ہندوستان کا گبن ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ اس نے واقعات لکھے ہیں اور تاریخ نامکمل ہے۔ لیکن ان کو ماننا چاہیے''۔

ارون کو مالی معاملات میں عبور کامل تھا۔ اس کی دلیل ایک تو وہ مضمون ہے جو اس نے کلکتہ ریویو میں 1869 میں شائع کرایا اور دوسری اس کی تصنیف کردہ مشہور کتاب موسومہ رینڈ ڈائی جس یالا آف پرزیجر۔

وہ ایک بذلہ گو، لطیفہ سنج، ظریف الطبع، نرم گفتار عالی حوصلہ اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے والا آدمی تھا اور ہمیشہ ہشاش بشاش رہا کرتا تھا۔

میرے نانا مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سر دفتر محکمہ اسٹامپ ریاست بھوپال ریاست بھوپال کی ملازمت سے پہلے محکمہ بندوبست دولت برطانیہ میں اکثر جگہ ملازم رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں مرحوم کو صاحب موصوف کے ماتحت غازی پور میں مہتمم عکس یا منصرم جانچ کے عہدے پر کچھ عرصے تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ

فرمایا کرتے تھے کہ" صاحب موصوف ایک بہت ہی سنجیدہ، متین اور فارسی میں بصیرت کامل رکھنے والے انگریز تھے۔ ان کی متانت نے انھیں خشک مزاج نہیں بنایا تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ جو لوگ ہندوستان کے قدیم اور شریف گھرانوں کے رکن ہوتے تھے۔ نسبتاً ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرتے تھے اور بیدل ان کی ترقی مناصب وعلوے مدارج کے خواہشمند رہتے تھے۔ اپنے مفوضہ سرکاری کاروبار کو تندہی سے انجام دیتے اور جو وقت بچتا اس کو مطالعہ تاریخ میں صرف کیا کرتے تھے۔ وہ خود جامع علوم وفنون تھے اور ایسے ہی لوگوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے" انسان اور خصوصاً مورخ کو ہر چیز جاننا چاہیے۔ جس چیز کو انسان حاصل کر سکے اس سے اسے گریز نہ کرنا چاہیے"۔ ان کی زندگی ایک طالب علمانہ زندگی تھی"۔

لیٹر مغل جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں ایک بے نظیر تاریخ ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ حسب بیان بالا اس کا ماخذ باشندگان یورپ کے خطوط، سفرنامے اور کتابیں بھی ہیں اور گو بہت کچھ مصنف نے تحقیق وتدقیق کے بعد لکھا ہے۔ مگر پھر بھی اپنی ہم قوموں، ہم جنسوں اور ہم ملکوں کے ساتھ اس خوش عقیدگی نے کہ ان کا لکھا آیت وحدیث ہے۔ بعض بعض جگہ اس کو مغالطہ دے ہی دیا ہے اور یہ تقاضائے بشریت ہے۔12

تخت طاؤس کی شکست پذیری

تخت طاؤس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ" وہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کے اجزا الگ الگ تہہ کر کے رکھ لیے جاتے تھے اور ضرورت کے وقت سب کو مرتب کر کے تخت بنالیا جاتا تھا1"۔ گو اس کا کافی ثبوت تواریخ قدیم سے قطعی نہیں ملتا۔ تاہم بعید از قیاس بھی نہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک بیش قیمت، بے بہا، نادر العصر اور اعجوبۂ روزگار چیز تھا۔ جہاں اس میں پائیداری ومضبوطی موجود تھی۔ وہاں نزاکت کا وجود بھی پایا جاتا ہوگا۔ نکالنے رکھنے کی سہولت اور گرد وغبار سے حفاظت میں آسانی وغیرہ وغیرہ پر نظر ڈال کر عجب نہیں کہ ایسا ہی بنایا گیا ہو۔

ہمیں اس سے بحث نہیں، اس کی قیمت کچھ ہی ہو، وہ اس طرح بنایا گیا ہو، کہ اس کے

پرزے پرزے الگ کیے جاسکتے ہوں۔ یا اس طرح کہ اس کے اجزا کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہو، اسے ٹھوس سونے سے بنایا گیا ہو۔ یا اس پر سونے کے پتر چڑھائے گئے ہوں۔ وہ ایک ایسا عجیب و غریب تخت ضرور تھا کہ جس کی نظیر آج تک دنیا کو میسر نہیں آئی۔ اس سے پہلے بھی کوئی تخت اس کے مثل یا اس سے بہتر صفحۂ تاریخ پر نظر نہیں آیا اور فی زمانہ بھی کہ روپے کی بہتات، جواہرات کی کثرت اور صنعت و حرفت کو انتہائی ترقی حاصل ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم سلاطین سُرِ حکومت پر جلوہ افروز ہیں۔ لیکن دنیا اس کی تمثیل پیش نہ کر سکی۔ وہ اپنی بے مثالی کی وجہ سے دیکھنے والوں کو محوِ حیرت بنا دیتا تھا۔ ایشیا و یورپ کے سیاح و سفرا، بڑے بڑے راجے مہاراجے اور فرمانروا، بڑے بڑے ماہرین صنعت و حرفت اسے دیکھ کر بے خود ہو جاتے اور تصویرِ حیرت بن جاتے تھے۔ اس پر جلوس کرنے والے کا رعب و دبدبہ، اس کی عظمت و شان دیکھنے والے کی نظر میں اس طرح جمتی اور اس کے قلب میں اس طرح سماتی تھی کہ دل بے اختیار مائل بہ عبودیت ہو جاتا تھا۔ اور یہ بھی برکات اسلام کا ایک معجزہ سمجھنا چاہیے کہ ایسی سطوت و ہیبت پیدا ہونے کے بعد بھی شاہجہاں نے اپنی عبودیت کے اظہار میں سرِ نیاز اس بے نیاز معبودِ حقیقی کے سامنے خم کیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا۔

گو اب بایں حیثیت مجموعی اس تخت کا صرف لفظی افسانہ باقی رہ گیا ہے۔ تاہم اس کی خوبی و صناعی کی تعریف و توصیف میں سارا عالم اب تک رطب اللسان ہے۔

نوٹ نمبر 1- لیز مغل -12

سال و مدت اتمام
اور کاریگروں کی تعداد، مولانا قدسی کی ایک بے مثل مثنوی و تاریخ
اور اس مثنوی کے متعلق شاہی قدردانی

تخت طاؤس پانچ لاکھ (500000) کاریگروں کے زیر نظام و صنعت 1 سات سال کی مدت میں 1044ھ/ 1634 میں تمام و کمال بن کر تیار ہوا جس کی تاریخ ہوئی۔ ع

سریر ہمایون صاحبقرانی[3]

1044ھ

میں نہیں کہہ سکتا کہ شاہجہاں کو اس کے کارناموں کے معاملہ میں خوش قسمت کہا جائے یا بدقسمت، چیزیں اس نے وہ بنوائیں کہ جن کی حقیقت کا اظہار رہتی دنیا تک ایک افسانہ رہے گا۔ مگر زمانہ نے کچھ اس طرح سے پلٹا کھایا کہ اس کی اکثر یادگاریں اور ان کی عظمتیں حادثات زمانہ کے ہاتھوں قائم نہ رہ سکیں، رہے نام اللہ کا ایک جامع مسجد ہے اور ایک تاج محل جن سے اس کی بلند حوصلگی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور بس۔ اگر اس کی تمام یادگاریں باقی رہ جاتیں تو انہیں دیکھ دیکھ کر دنیا ہمیشہ محو حیرت رہا کرتی۔ یہ بھی بسا غنیمت ہے کہ ان چیزوں کی یادگار کسی نہ کسی طرح قائم رکھنے والے اس وقت موجود تھے۔ جنھوں نے ان کو قطعی محو نہ ہونے دیا "تخت طاؤس" ہی کو لے لیجیے۔ گو اس کے ظاہری وجود کی طرح آج اس کی شبیہ بھی معدوم ہے۔ مگر لفظی تصویر مولانا قدسی[4] کی سحر نگاریوں کی مرہون منت ایک مثنوی کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہے۔ جس کی حقیقی قدر کچھ اسی نے کی جو جان قدر دانی تھا۔ یعنی جوہر شناس اور نکتہ نواز بادشاہ کے حکم سے موصوف کی اس مثنوی کا کتبہ مینائے سبز سے تخت کے اندرونی حصے میں منقش کیا گیا[5]۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ اس مثنوی کی قدر و منزلت ہو بھی نہیں سکتی تھی وہ مثنوی ذیل میں درج ہے۔ اس کے آخری مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے:

زہے فرخندہ تخت بادشاہی　　کہ شد ساماں بتائید الٰہی
فلک روزے کہ میکردش مکمل　　زر خورشید را بگداخت اوّل
بحکم کار فرما صرف شد پاک　　بہ میناکاریش مینائے افلاک
خبر ایں تخت از زر و جوہر چہ مقصود　　وجود بحر و کاں را حکمت ایں بود
زیاقوتش کہ در قید بہا نیست　　لب لعل بتاں را دل بجا نیست
برائے پایہ اش عمرے کشیدہ　　کہ افسر بسر خاتم بدیدہ
بخرجش عالم از زر شد چناں پاک　　کہ شد از گنج خالی کیسۂ خاک

رساند گر فلک. خود را بپایش　　دہد خورشید و مہہ را دو نمایش
سرافرازے کہ سر بر پایہ اش سود　　ز گردوں پایۂ بر بخت افزود
خراج بحر و کاں پیرایۂ او　　پناہ عرش و کرسی سایۂ او
ز انواع جواہر گشتہ الواں　　چراغ عالمے ہر دانۂ آں
در اطرافش بود گل ہائے مینا　　فروزاں چوں چراغ طور سینا
چوں کرد از فرازش کوتہی دست　　نگیں خویش جم بر پایہ اش بست
شب تار از فروغ لعل و گوہر　　تواند صد فلک را داد اختر
دہد شاہجہاں را بوسہ بر پائے　　ازاں شد پایۂ قدرش فلک سائے
کند شاہ جہاں بخش و جواں بخت　　خراج عالمے را خرجِ یک تخت
خداوندے کہ عرش و کرسی افراخت　　تو ابر قدرتش تختے چنیں ساخت
اثر باقیست تاکان و مکاں را　　بود بر تخت جا شاہِ جہاں را
بود تختے چنیں ہر روز جایش　　خراج ہفت کشور زیر پایش

چو تاریخش زباں پرسید از دل
بگفت'' اورنگ شاہنشاہ عادل''

1044ھ

نوٹ نمبر1-'' آگرہ اخبار'' آگرہ مورخہ 7-نومبر 1928 بحوالہ اخبار''فیلڈ''۔12

نوٹ نمبر2-'' سیر،ظفر نامہ بادشاہ نامہ اور مآثر الامرا=12

نوٹ نمبر3-'' بادشاہ نامہ وسیر=12

نوٹ نمبر4-قدسی۔محمد جان نام،قدسی تخلص،مشرف بہ حج ہونے کے باعث'' حاجی''لقب،مشہد کا رہنے والا تھا۔کتاب'' جہاں آرا'' میں اس کا نام محمد خان لکھا ہے۔علی ہذا البعض تذکرہ نویسوں نے اس کا تخلص ''قدوسی''ظاہر کیا ہے جو بظاہر کتابت کی غلطی ہے۔1042ھ میں ہندوستان پہنچ کر ملازمان دربار شاہجہانی کے زمرے میں شامل ہوا۔1052ھ/1646 کو روح قدسی نے عالم قدس کی جانب پرواز کی۔ابو طالب کلیم نے

تاریخ وفات کہی.....ع

دورزاں بلبل قدسی چمنم زنداں شد

''اور نٹیل بیا گرفیکل ڈکشنری'' میں لکھا ہے کہ شاہجہاں نے اس کو خطاب ملک الشعرا بھی دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ خطاب ابو طالب کلیم ہمدانی کو عطا ہوا۔ لیکن بادشاہنامہ خزانہ عامرہ اور ماثر الامرا وغیرہ سے ایسا ثابت نہیں کہ قدسی کو بھی یہ خطاب ملا ہو اور ان کے مقابلہ میں لغات مذکور کا اعتبار ظاہر۔

قدسی کی مثنوی وقصیدہ گوئی معراج بلاغت کو پہنچ گئی تھی۔ غزل اس رتبہ کی نہیں۔ اکثر قصائد اقتضاب کے عیب سے پُر ہیں جو گراں گزرتا ہے۔ بقول اورینٹل بیل اس نے ایک کتاب فن انشا میں بنام ظفر نامہ اور بقول صاحب خزانہ عامرہ ایک مثنوی موسومہ بادشاہ نامہ صاحب قران ثانی اپنی یادگار چھوڑی۔ اسی کا شعر ہے۔

شادم کہ بمرگم نہ شود شاد دل غیر　　دانم کہ بمرگ از تو مرا نیست جدائی

اتخاذ از مضمون خود بہ عنوان مولانا قدسی مشہدی جو رسالہ'' صبح صادق'' جھانسی بابت ماہ نومبر دسمبر 1926 میں شائع ہوا۔

نوٹ نمبر 5- بادشاہ نامہ۔ 12

تخت طاؤس پر جلوس اوّل

تخت طاؤس پر جلوس اول کے متعلق بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ منوچی 1 کہتا ہے شاہجہاں اس تخت پر بیٹھا ہی نہیں بلکہ سب سے پہلے اس پر اورنگ زیب نے جلوس کیا 2 تھا''۔ لیکن تخت مذکور 07 جلوس شاہجہانی میں بن کر تیار ہو گیا تھا اور شاہجہاں تخت بننے کے 23-24 سال بعد تک حکمرانی کر کے 31 ج میں معزول ہوا تھا۔ تکمیل و اتمام تخت اور عزل شاہجہانی کے وسطی زمانہ میں کئی بڑے بڑے جشن ہوئے۔ جن میں سے 8 ج کا دہ روزہ جشن 3 نوروزی منعقدہ قلعہ آگرہ 18 ج 1054ھ کا جشن بتقریب حصول صحت نواب، عصمت مآب، تقدس احتجاب علیۃ العالیہ جہاں آرا بیگم المعروف بہ بیگم صاحب کلاں (بڑی بیگم صاحب) اسی سنہ کا جشن شمسی 5 جس کے اخراجات کی متکفل خود بیگم صاحبہ موصوفہ تھیں۔ 21 ج/1057ھ کا دربار افتتاحی قلعہ معلیٰ (دہلی) اور اسی سنہ کا ایک مشہور نہ روزہ جشن جو'' بار عام'' مذکور الصدر کے

سلسلہ میں جشن وزن قمری6 تک ہوتا رہا۔ یہ سب تقریبات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے کہ ایسے ایسے شاندار و موقر درباروں اور جشنوں میں شاہجہاں جیسے صاحب شکوہ نوادر پسند بادشاہ نے اس اعجوبہ روزگار مجسمہ صنعت نوازی کو باوجود تیاری شرف جلوس و خلعت قبول نہ بخشا ہو۔

منوچی کا یہ بیان ویسا ہی باور ہوا ہے جیسا کہ ٹیورنیر کا یہ خیال کہ "یہ وہ مشہور و معروف تخت ہے۔ جسے تیمور لنگ نے بنوانا شروع کیا تھا اور شاجہاں نے تکمیل کو پہنچایا7۔

جمہور مورخین کی تصدیق کے مطابق جس زمانہ میں یہ تخت بن کر تیار ہوا ہے، شاہجہاں کشمیر سے واپس ہوکر لاہور کی طرف مراجعت کر رہا تھا8۔ وہ اس سفر سے 30 رمضان 1044ھ (2۔فروری 1634)=8 جلوس) کو آگرہ واپس آیا۔ اور چونکہ نجومیوں نے (اندرون شہر) آگرہ کے داخلہ کی تاریخ یکم شوال 1044ھ مطابق 2 فروری 1634 معین کی تھی۔ اس لیے جشن نوروزی9 کے رسمی دربار کا جمنا پار منعقد ہونا قرار پایا اور کار پردازان سلطنت ایوان دولت خانہ خاص و عام10 دارالخلافہ (آگرہ) کے زیب و زینت پر مامور ہوئے11۔

ہم اس آرائش و زیبائش کی کیفیت شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم و مغفور کی قلم معجز رقم سے زیب قرطاس کرتے ہیں۔

اول انھوں (کار پردازان سلطنت) نے 12ایکی مخمل و زربفت کی کہ گجرات کے صنعت گروں اور ہنروروں نے بنائی تھی اور اس میں طرح طرح کی صنعتیں کی تھیں اور ایک لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی تھی ایوان 13 چہل ستون کی پیش گاہ میں زرین و سیمین ستونوں پر استادہ کی اور اس کے اطراف میں زربفت و مخمل کے شامیانے چاندی سونے کے ستونوں پر تانے، پھر زمین پر زرین و رنگین فرش بچھائے گئے اور اسپک 14 کے نیچے ایک مرصع چبوترہ بنایا گیا اور اس کے چاروں ضلعوں پر ایک مجر زریں نصب ہوا اور اس کے عین وسط میں تخت طاؤس رکھا گیا اور تخت کے چھتر ہائے مرصع جن میں موتیوں کی لڑیاں لگی ہوئی تھیں (8-8 فٹ طولانی سرتاپا غرق جواہرات چوبوں پر) لگائے گئے اور در و دیوار، سقف و جدار و طاق اور خاص و عام کے احاطوں کے اطراف

اور نقار خانہ 15 کی عمارت اور ہر دروازے کے پیش طاق جن کی تزئین کے متکفل شاہزادے (اور امرا16) تھے ان سب کو ہر دیار کے اقمشۂ نفیسہ، مخمل طلاباف ونقرہ باف اور زربفت ایرانی و دیبائے رومی سے منڈھا اور سب جگہ اس مجلس میں سونے کے مرصع کار ظروف ترتیب سے چنے گئے 17۔

نوٹ نمبر 1- منوچی- ایک پرتگالی سیاح اس کی کتاب "اسٹوریاڈوگومور" بہت مشہور ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر سرکار نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "اورنگ زیب" میں لکھا ہے:

"ایک معمولی کم علم آدمی تھا۔ اس نے بہت سی بے سروپا اور سنی سنائی باتیں لکھی ہیں"

نوٹ نمبر 2- منوچی اسٹوریاڈوموگور جلد دوم صفحہ 348=12

نوٹ نمبر 3- جشن نوروزی۔ نوروز کے دن کو عام طور پر اہل ایشیا خواہ وہ کسی مذہب وملت کے ہوں عید مانتے ہیں۔ ترکان چنگیز کا کوئی مذہب نہ تھا۔ مگر اس دن مکان سجا کر خوان یغما لگاتے اور سب مل کر لوٹتے تھے اور سال بھر کے لیے مبارک شگون سمجھتے تھے۔ آتش پرستوں اور ہنود کے یہاں یہ دن زیادہ متبرک سمجھا جاتا تھا۔ اکبر نے تالیف قلوب کے لیے اس میں ہندوانہ مراسم اور شامل کر دیے تھے۔ اس دن دیوان عام خوب سجتا زبردست دربار ہوتا تھا۔ اکثر امرا بادشاہ کی دعوت کرتے اور نذریں دیتے تھے بادشاہ سونے کی ترازو میں سونا، چاندی، ابریشم، خوشبویات، لوہا، تانبا، جست، توتیا، گھی، دودھ، چاول اور ست نجے کے ساتھ تلتا اور یہ سب غربا کو تقسیم ہوتا تھا۔ (ماخوذ از دربار اکبری)

نوٹ نمبر 4- جہاں آرا بیگم۔ جہاں آرا بیگم نام، نواب علیہ العالیہ خطاب، بیگم صاحبہ کلاں مشہور، پہلے بیگم صاحبہ کہلاتی تھی۔ مگر اپنی چھوٹی بہن روشن آرا بیگم کے اسی عرف سے معروف ہونے کے بعد "بڑی بیگم صاحب" کہلانے لگی۔

ممتاز محل کے بطن سے جن دنوں شاہجہاں میواڑ کی مہم میں مصروف تھا چہار شنبہ کے دن 21 صفر 1023 کو پیدا ہوئی۔ ممتاز محل کی پہلی اولاد تھی۔ جو زندہ رہی، شاہجہاں کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ملک الشعرا ابو طالب کلیم ہمدانی کی بہن اور رکنائے کاشی کی بی بی ستی النساء خانم الخاطب بہ صدر النساء (المتوفی 1056ھ) کے زیر تربیت وتعلیم رہی، ممتاز محل، دیوانجی خانم اور نور جہاں کے فیضان صحبت کے علاوہ پایہ

تخت کے اکثر ارباب کمال سے استفادہ کیا۔ ماں کے مرنے کے بعد باپ کے مزاج میں بہت دخیل ہوگئی تھی۔ اپنے بھائیوں میں داراشکوہ سے اس کو بے حد محبت تھی۔ اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں میں جو خانہ جنگی ہوئی اس میں باپ اور بھائیوں میں اکثر ذریعہ صفائی بنی۔ لیکن اس کی بات کو کسی نے نہ مانا۔ شاہجہان کے زمانہ نظر بندی میں وہ اس کی خدمت کرتی رہی۔ 70 سال کی عمر میں 7 رمضان 1092ھ/1689ء میں بمقام دہلی وفات پائی اور حسب وصیت صحن روضۂ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ میں مدفون ہوئی مقبرہ بصورت حجر کھلی چھت کا بنا ہوا ہے۔ لوح مزار خام اور ہمیشہ سبز گھاس سے سبز پوش رہتی ہے۔ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے۔

ھوالحی القیوم

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا   کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا بیگم مرید خواجگان چشت بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ، 1092ھ

وہ قرآن مجید خوش الحانی اور صحت لفظی کے ساتھ قواعد تجوید کے موافق پڑھنے میں طاق تھی۔

سیاحت نے اس کی نظر میں وسعت پیدا کر دی تھی اور ایک حسین، باسلیقہ، خوش پوش اور خوش گزران بیگم تھی۔

فن تاریخ سے خاص طور پر دلچسپی رکھتی تھی اور خواجگان چشت کی بے حد معتقد تھی۔ اس نے ''مونس الارواح'' کے نام سے تذکرہ خواجہ غریب نواز لکھا ہے۔ جس میں آپ کے بعض خلفا کے حالات بھی ہیں۔ یہ کتاب بتلاتی ہے کہ وہ پایہ کی انشا پرداز تھی۔ جا بجا عربی جملوں کا استعمال اس کی عربی دستگاہ کی دلیل ہے۔

مضامین کی ترتیب، عبارت کی نشست، الفاظ کی تلاش و موزونیت بتلاتی ہے کہ وہ ملک فصاحت کی حکمران تھی۔ حمد، نعت، منقبت اور مدح بزرگان میں جو جا بجا اشعار لکھے ہیں وہ بتلاتے ہیں کہ نظم میں بھی وہ پایۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ ذیل کے اشعار اس مرثیہ کے اشعار ہیں جو اس نے شاہجہاں کی وفات پر فی البدیہ کہا اور اب اس کے اسی قدر شعر پائے جاتے ہیں۔

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر   آیا شب فراق ترا ہم بود سحر
اے بادشاہ عالم واے قبلۂ جہاں   بکشائے چشم رحمت و برحال ما نگر
نامم چنیں ز غصہ و بادم بود بدست   سوزم چو شمع در غم و دودم رود ز سر

کلام فہمی اور اہل کمال کی قدر دانی اس کا خاندانی ورثہ تھا۔ رحم دلی اور شرم وحیا کا مجسمہ تھی۔ اس کے اخلاق وعادات اور اس کا چال چلن ہر طرح قابل ستائش دکھائی دیتا ہے۔ تمام مورخ اس کو "فرشتہ سیرت" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ الا ڈاکٹر برنیر اور اس کا ہمنوا ٹیورنیر کہ انھوں نے بے چاری کو بہت بدنام کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا کہیں کچھ اور کہیں کچھ کہنا۔ دروغ گو را حافظہ نباشد کے تحت میں آ کر انھیں غلط گو ثابت کر دیتا ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس نے اپنی تمام زندگی تجرد، ریاضت، نفس کشی میں بسر کی جیسا کہ عام طور پر مغل شاہزادیاں کرتی تھیں۔ جس کی وجہ بقول برنیر یہ ہے۔ "کہ مغل سلاطین ایک تو اپنا ہمسر نہ پا کر اپنی لڑکیوں کے منسوب کرنے سے باز رہتے تھے۔ دوسرے انھیں اپنے اقربا سے اکثر بغاوت کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔" اس بیگم نے بہت سی خوب صورت اور پاکیزہ عمارتیں بنوائی تھیں۔ جو اب تک اس کی یادگار ہیں اور صدقۂ جاریہ کا کام دیتی ہیں۔ مندرجہ ذیل عمارات زیادہ مشہور ہیں:۔

(1) جامع مسجد آگرہ۔ بصرف 5 لاکھ روپیہ۔

(2) بیگمی دالان۔ اجمیر شریف۔ یہ درگاہ خواجہ غریب نوازؒ۔ یہ سنگ مرمر کی بہترین عمارت ہے۔ اس میں سنگ افشاں ابری کا فرش ہے۔ درمیانی محراب پر جو جواہرات کی بے نظیر پچی کاری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نور جہاں کے گلے کی دھگدھگی ہے۔

(3) کاروانسرا۔ دہلی۔ برنیر نے اس کو رائل پلیس (فرانس) سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کے پیرس میں واقع ہونے کی تمنا کی ہے۔

(ماخوذ از جہاں آرا۔ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ اور تاریخ آگرہ منشی سیل چند)

نوٹ نمبر 5-6۔ جشن شمسی۔ جشن قمری۔ سلاطین مغلیہ نے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے ان کی بعض رسمیں اختیار کر لی تھیں۔ جن کو اکبر کے عہد سے اس سلسلہ کے اختتام تک سب بادشاہ بجالاتے رہے۔ مثلاً تلادان یعنی سال شمسی و قمری کے حساب سے جب بادشاہ کی عمر کا کوئی سال شروع ہوتا تھا۔ تو بادشاہ نے سونے چاندی کے ساتھ تلنا تھا۔ اور وہ سب سونا، چاندی مستحقین کو بطور خیرات دے دیا جاتا تھا۔ سال شمسی کا جشن "جشن شمسی" اور سال قمری والا جشن "جشن قمری" کہلاتا تھا۔ (دربار اکبری اور حواشی وقائع سیاحت برنیر۔ مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب)

نوٹ نمبر 7- پرشیا اینڈ دی پرشین کوئیسچن ۔12

نوٹ نمبر 8-ظفر نامہ=12

نوٹ نمبر 9-جشن نوروزی۔ دیکھو حاشیہ 3 صفحہ 179

نوٹ نمبر 10-

نوٹ نمبر 11-ظفر نامہ=12

نوٹ نمبر 12و14-اسکی یا "امپک" فارسی میں بڑے خیمے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا شامیانہ تھا جو "دل بادل" بھی کہلاتا تھا۔ اس کا طول ستر گز اور عرض پینتالیس گز تھا۔ باہر کی طرف اس میں سرخ کپڑا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن (گجرات) کی بنی ہوئی مخملی چھینٹ لگی ہوئی تھی۔ جس کے رنگ بہت ہی تیز اور شاداب تھے بیل بوٹے ایسے موزوں بنائے گئے تھے کہ تختہ گلزار کی سیر کا لطف آتا تھا۔ سات سال کے عرصے میں یہ صرف ایک لاکھ روپیہ گجرات میں بن کر تیار ہوا تھا۔22-22 گز اونچی چاندی کی چوبوں پر جن میں سے تین مثل مستول جہاز اور بھی بلند تھیں تانا جاتا تھا تین ہزار فراش اسے استادہ کیا کرتے تھے۔ بارہ سو گز زمین گھیر لیتا تھا اور دس ہزار آدمی اس کے سائے میں بیٹھ سکتے تھے۔

(ظفر نامہ شاہجہاں، سفر نامہ ڈاکٹر برنیر، غیاث اللغات و برہان قاطع)

نوٹ نمبر 13-ایوان چہل ستون۔ شاہجہاں سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دربار عام کے لیے کوئی ایسا بڑا مکان موجود نہ تھا جہاں دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو اس لیے شاہجہاں نے اپنے جلوس کے پہلے سال میں حکم دیا کہ قلعہ آگرہ، لاہور اور برہان پور میں دربار عام کے لیے چالیس چالیس ستونوں کی تین عالیشان عمارتیں بنائی جائیں۔ اور چونکہ یہی ایک ایسا مقام تھا جہاں رعایا کا ہر ایک شخص اپنے عرض حال کے لیے باریاب ہو سکتا تھا۔ اس لیے تیار ہونے پر ان کا نام عام و خاص رکھا۔ آگرے کے عام و خاص کی تیاری پر ابو طالب کلیم نے اس کی تعریف میں یہ رباعی کہی۔

ایں تازہ بنا کہ عرش ہمسایۂ اوست　　رفعت حرفے ز زینہ پایۂ اوست

باغیست کہ ہر ستون سبزش بر وست　　کآسائش خاص و عام در سایۂ اوست

مذکورہ بالا چالیس ستونوں کی وجہ سے یہ عمارتیں "چہل ستون" بھی کہلاتی تھیں۔ سفر کی حالت میں یہ

کام پٹاپٹی کے کام کے ایک بہت بڑے خیمے سے جس میں اندر کی طرف مچھلی پٹن کی چھینٹ لگی ہوتی تھی لیا جاتا تھا۔ اور اس خیمہ کو اونچے مقام پر نصب کیا جاتا تھا۔ تاکہ دور سے پہچانا جاسکے۔ اور دادخواہ بے روک ٹوک آسانی کے ساتھ حضور شاہی میں باریاب ہو سکے۔ خان صاحب، مولوی محمد اسماعیل خان مرحوم پنشنر ہیڈ مولوی سنٹرل نارمل اسکول آگرہ نے جو اردو کے ایک بہت بڑے خدمت گزار تھے۔ اور جن کا مدۃ العمر اردو پر احسان رہے گا۔ قلعہ آگرہ کی عبرتناک حالت پر ایک مثمن لکھا تھا۔ یہاں اس کا وہ حصہ جس سے عام و خاص کی موجودہ رقت خیز و عبرت انگیز تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نقل کیا جاتا ہے۔

وہ قصر معلّی کہ جہاں عام تھا دربار آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
وہ سقف زر اندوہ ہے مانند چمن زار وہ فرش ہے مرمر کا مگر چشمہ انوار
اب بانگ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار سرہنگ کمر بستہ، نہ وہ مجمع نظار
کہتا ہے کبھی مرکز اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیت کو مرا وقر تھا منظور نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
شاہان معاصر کا معین تھا یہ دستور کرتے تھے سفیران ذوی القدر کو مامور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُر نور آوازہ مری شان کا پہنچا تھا بہت دور
اکناف جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہلت ہزاری

وہ 'چتر' وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں؟ وہ شان وہ تو ئیں وہ خاقان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور، وہ دیوان کہاں ہیں؟ خُدّامِ ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟
وہ دولت مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟ فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں؟
سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خاں و خواقین زمیں بوس"

(تاریخ خافی خان، سفرنامہ برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین، تزک اردو مولفہ مولوی محمد اسماعیل خان صاحب۔)12

نوٹ نمبر 15-نقار خانہ۔ یہ دربار تو آگرہ میں ہوا تھا۔ اور وہاں کا نقار خانہ عام و خاص کے جانب ہے۔ لیکن دہلی کے نقار خانے کے متعلق برنیر لکھتا ہے "عام و خاص میں جس دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ اس پر ایک بڑا بالا خانہ بنا ہوا ہے۔ جس کے دروازے عام و خاص کی طرف ہیں۔ اس میں نفیریاں، شہنائیں اور نقارے رکھے رہتے ہیں، جو دن اور رات کو اوقات معینہ پر اکٹھے بجائے جاتے ہیں۔ نو وارد اہل فرنگ کو اس کی آواز نہایت کریہہ معلوم ہوتی ہے۔ جب میں آیا ہی آیا تھا مجھے بھی گراں گزرتی تھی۔ لیکن اب سنتے سنتے کان عادی ہو گئے ہیں۔ اس کی آواز بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ رات کے وقت دور سے۔ (میر حسن نے اپنی بے مثل مثنوی میں کیا خوب کہا ہے۔

سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا　　　کہیں دور سے کان پڑتی تھی آ)

نفیری جو "قرنا" کہلاتی ہے نو فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا قطر ایک فرانسیسی فٹ سے کم نہیں اور لوہے یا پیتل کا چھوٹے سے چھوٹا نقارہ چھ فٹ قطر کا ہے"۔

نوٹ نمبر 16- یہاں "امرا" کا لفظ میں نے بڑھایا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے در و دیوار اور عمارات گرداگرد خاص و عام کی تزئین کا متکفل صرف شاہزادوں کو لکھا ہے۔ لیکن برنیر اور ٹیورنیر جو بذات خود دربار مغلیہ میں عرصے تک رہے ہیں۔ صرف امرا کو لکھتے ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ عام و خاص کے گرداگرد جو غلام گردش تھی۔ اس کی ایک ایک محراب بڑے بڑے امرا کے سپرد تھی۔ اور ہر ایک کو اس کی مفوضہ محراب کے متعلق بادشاہی حکم تھا کہ اسے اس کے متعلقات سمیت اپنے صرف سے آراستہ پیراستہ کرے۔ یہ امرا بادشاہ کو خوش کرنے، درباروں کی رونق بڑھانے کے لیے آرائش و زیبائش میں اپنی امکانی طاقت خرچ کر دیتے تھے۔ اور ایک دوسرے پر فوق لے جانے میں ساعی ہوتے تھے۔ انجام یہ ہوتا تھا کہ مذکورہ بالا غلام گردش عجائبات عالم کا نمونہ بن جایا کرتی تھی۔ عجب نہیں کہ مثل امرا کے ایک ایک حصہ شاہزادوں کے سپرد بھی ہوتا ہو بلکہ یہ امر اس حیثیت سے کہ وہ بھی مناصب و مراتب کی حیثیت سے ذی اقتدار امرا میں شامل تھے یقینی ہے۔

نوٹ نمبر 17 ظفر نامہ، شاہجہاں۔12

سنہ اور محل جلوس اولیں

بادشاہ جمجاہ نے بعد فراغ نماز عید الفطر دولت خانہ گھاٹ سے بسواری کشتی مینو سواد

اکبر آباد میں نزول اجلال فرما کر غرۂ شوال المعظم 1044ھ=3 فروری 1634 کو بروز جمعۃ المبارک ٹھیک بارہ بجے دن کے تخت طاؤس پر جلوس فرمایا1۔

شاہزادوں، سلاطین 2، راجگان مہاراجگان ہند، اراکین دولت، عمائدین سلطنت اور سفرائے ممالک خارجہ نے بذات خود یا کسی عذر کے باعث بتوسط وکلا3 عقیدت مندی اطاعت شعاری اوراخلاص مندی کا اظہار کر کے حضور شاہی میں نذریں گزرانیں اور تحائف ونفائس پیش کیے۔

نوٹ نمبر1-ظفر نامہ=12

نوٹ نمبر2-سلاطین۔جمع سلطان بمعنی فرمانروا وصاحب حکمت لیکن حسب بیان مولانا آزاد دہلوی مرحوم خاندان چغتائی کی اصطلاح میں بادشاہ اور ولی عہد کے سوا جو خاندان کے بھائی بند ہوتے تھے "سلاطین" کہلاتے تھے بلکہ مجازاً ایک کو بھی "سلاطین کہہ دیتے تھے۔ (دربار اکبری) اردو میں اس قسم کے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں۔ جو ہیں تو درحقیقت جمع مگر واحد کے معنی میں آتے ہیں۔ مثلاً نواب کہ جمع نائب ہے۔ میں نے بھوپال میں وہاں کے حکمران خاندان کے ایک رکن کے لیے بھی "اخوان الریاست" (جو درحقیقت جمع ہے) بولتے ہوئے سنا ہے۔

نوٹ نمبر3-دربار مغلیہ کا آئین تھا کہ ہر شاہزادے اور رکن سلطنت کا ایک ایک وکیل دربار شاہی میں موجود رہتا اور علاوہ اپنے آقا کو درباری وضروری خبریں پہنچانے کے جملہ احکام شاہی کی تعمیل اور مراسم درباری بجا آوری اپنے آقا کی طرف سے بطور مختار کل انجام دیتا تھا۔

ابوطالب کلیم ہمدانی وغیر کے قصیدے اور شاہی حوصلہ افزائی

ملک الشعرا، ابوطالب کلیم ہمدانی نے قصیدہ تہنیت جشن پیش کیا جس کا مطلع تھا

خجستہ مقدم نوروز وغرۂ شوال　　　فشاندہ اند چہ گلہائے عیش برسر سال

شاہجہاں نے اس قصیدے کے صلے میں کلیم کو روپیہ کے برابر تلوایا، چنانچہ 5500 روپے وزن میں آئے اور اسے عطا ہوئے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ شاعر مذکور سونے میں تولا گیا اور ہم وزن طلا اس کو روپیہ انعام ہوا1۔

شادمان سلطان نے جو گھکر کی شاہی نسل سے تھا اور جس نے لقب سلطانی اختیار کر لیا

تھا۔ اس موقع پر بادشاہ اور تخت کی مدح میں ایک بہترین مثنوی لکھی اور معقول انعام پایا2۔ کسی پنڈت نے کبت کہہ کر پیش کی اور اس کا منہ موتیوں سے بھرا گیا3۔

نوٹ نمبر1- ظفرنامہ شاہجہاں=12

نوٹ نمبر2- قاموس المشاہیر= 12

نوٹ نمبر3- قصص ہند آزاد

شاہجہاں کی ایک غیر معمولی عنایت

یمین الدولہ، آصف خان کو خان خانانی وسپہ سالاری کے خطاب و مراتب1 عطا ہوئے اور نہ صرف یہ بلکہ خود بدولت خان موصوف کے مکان پر تشریف لے گئے۔ جو حد درجہ کی عزت افزائی تھی2۔

یہ شاہانہ، سالانہ جشن نوروزی جو بادشاہ کی آٹھویں سالگرہ تاجپوشی کی یادگار میں تھا، دس دن تک منایا گیا اور اس مدت دہ روزہ میں ایک ہزار خلعت اور لاکھوں روپیہ نقد شاہزادوں، بیگمات، امرا عمائدین، سفرا اور سیاحین کو مرحمت ہوا۔

نوٹ نمبر1- مراتب و مناصب مغلوں کے عہد میں ملازمین و امرا کے مدارج اور ان کی تنخواہوں میں وقتاً فوقتاً تغیر تبدل ہوتا رہا۔ عموماً امرا کا منصب ہزاری سے ہفت ہزاری، نہ ہزاری، دہ ہزاری، اور دوازدہ ہزاری تک ہوا کرتا تھا۔ تنخواہ کا اندازہ سواروں کے شمار اور گھوڑوں کی تعداد پر تھا۔ عموماً ہر سوار کو دو گھوڑے رکھنا پڑتے تھے۔ آئین اکبری سے واضح ہوتا ہے کہ امرا اور منصب داروں کو اپنے منصب کے اندازے سے گھوڑے، یابو، ہاتھی، اونٹ، خچر، چھکڑے اور گاڑیوں کی مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی۔، چنانچہ پنج ہزاری امیر کو 337 گھوڑے اور یابو، 100 ہاتھی، 80 اونٹ، 20 خچر، 160 چھکڑے اور گاڑیاں ان کے خرچ خوراک وغیرہ کے لیے پنج ہزاری امیر کو (علاوہ تنخواہ فوج کے جو اس کو رکھنا پڑتی تھی) تیس ہزار (30000) روپیہ سرکار شاہی سے ملتا تھا۔

شاہجہاں نے اپنے عہد میں بست ہزاری تک کا منصب قائم کر دیا تھا۔ جس پر دارا شکوہ ممتاز تھا۔

ہفت ہزاری کے منصب سے زیادہ عموماً کسی کو نہ ملتا تھا اور اس پر بھی ایک وقت میں بقول خافی خان 4 امرا سے زیادہ فائز نہ ہوتے تھے۔ آصف خان کو بھی بطور غیر معمولی عنایت کے نہ ہزاری منصب عنایت کیا گیا تھا۔

ہندو امرا کی حد ترقی (جن کو آج کل کی اصطلاح میں "نیو" کہتے ہیں) شاہجہاں کے دوسرے دہ سالہ تک پنج ہزاری سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آخر میں یہ حد توڑ دی گئی تھی۔ اور مہاراجہ جسونت سنگھ ہفت ہزاری اور راجہ مرزا جے سنگھ شش ہزاری کر دیے گئے تھے۔ امرا کی تعداد مقرر تھی اور وہ صاحب مراتب ہوتے تھے۔ ان سے کم اور سواروں سے زیادہ رتبہ کے لوگ منصب دار کہلاتے تھے۔ یہ مخصوص معزز درجہ ہوتا تھا اور امرا انھیں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ ان کے پاس شاہجہاں کے عہد سے سوار وغیرہ نہ ہوتے تھے۔ صرف 5-6 گھوڑے رکھتے تھے اور بجز بادشاہ کے کسی کے ماتحت نہ ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ ڈیڑھ سو سے سات سو تک ہوتی تھی۔ اور بخلاف امرا کے غیر معین تعداد میں رہتے تھے۔

منصب داروں کے بعد سواروں کا رتبہ تھا۔ جو امرا کے ماتحت ہوتے اور دو قسم پر منقسم تھے۔ (1) دو اسپی (2) یک اسپی۔ دو اسپہ کی تنخواہ نسبتاً یک اسپہ سے زیادہ ہوتی تھی۔ اور گو ان کی تنخواہ خزانہ شاہی سے ملتی تھی۔ مگر تنخواہ کی کمی و بیشی وہ جس امیر کے ماتحت ہوتے اس کی سیر چشمی پر منحصر ہوتی تھی۔ ان کی تنخواہ روزانہ ملتی تھی۔

سواروں کے بعد روزینہ داروں کا نمبر تھا۔ یومیہ تنخواہ پاتے تھے اور گو سواروں سے ذرا کم رتبہ شمار ہوتے تھے۔ مگر تنخواہیں بیش قرار پاتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض بعض تو منصب داروں سے زیادہ تنخواہ پانے لگتے تھے۔ یہ بے شمار ہوتے اور عموماً متصدی و نائب متصدی وغیرہ کے عہدوں پر کام کرتے تھے۔

ان کے بعد پیدل کا نمبر تھا۔ یہ سب سے کم تنخواہ عـــہ یـعـــہ یا عـــہ پاتے تھے۔ گولہ اندازوں کی تنخواہ بہت ہوتی تھی۔ خصوصاً ڈچ، پرتگالی، جرمنی اور فرانسیسوں یعنی اہل مغرب کی۔ پہلے یہ کئی کئی سو ماہانہ پاتے تھے مگر بعد میں عـــہ سے زیادہ کسی کو نہ ملتا تھا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دربار مغلیہ کا دستور تھا کہ جب تک امرا کی طرح شہزادے کسی مہم وغیرہ پر مامور نہ ہوتے تھے ان کو کوئی مرتبہ یا منصب نہ ملتا تھا۔ بلکہ ان کے ذاتی اخراجات کے لیے انھیں روزانہ ایک معقول و معینہ رقم دی جاتی تھی۔ جیسے کہ شاہزادہ مراد بخش کو پانچ سو روپیہ روز ملتا تھا۔ (ماخوذ از حواشی "وقائع سیاحت برنیر" سترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب)=12

نوٹ نمبر 2- سیر المتاخرین=12

تخت طاؤس کا دہلی پہنچنا

1057ھ (1648) = 21 جلوس میں دارالسلطنت آگرہ سے دہلی (شاہجہاں آباد) منتقل ہوا1۔ اور تخت طاؤس بھی وہیں گیا2۔ گو دلی پہنچ کر ایک اور بھی مرصع تخت بنوالیا گیا تھا۔ اور عام طور پر بادشاہ اسی پر رونق افروز ہوا کرتا تھا۔ لیکن خاص خاص مواقع بالخصوص سالانہ جشن سالگرہ تاجپوشی کے موقع پر تخت طاؤس ہی زینت دربار ہوا کرتا تھا2۔

مولانا آزاد دہلوی مرحوم نے آبادی جہاں آباد، قلعہ معلیٰ کے افتتاحی دربار اور سالانہ جشن کا قصہ جس دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے اسے ہم نقل کر آئے ہیں تکرار بیان کی ضرورت نہیں (ملاحظہ ہو صفحہ نمبر 60-62)

یہ جشن و دربار 24 ربیع الاول 1057ھ (1647) کو = 21 جلوس میں بروز سہ شنبہ منعقد ہوا۔ حسب دستور حضور شاہی میں پیش بہا نذریں گزریں، منجملہ ان کے بارہ لاکھ روپیہ کی تو صرف جنس ہی تھی۔ جس نے شرف قبولیت پایا4۔ دریائے کرم شاہی جوش میں آیا، اور ہر ایک علیٰ قدر مراتب مالا مال ہو گیا۔ میر یحییٰ کاشی کو اس صلہ میں کہ اس نے عمارات و آبادی شاہجہاں آباد کی تاریخ کہی تھی.....مع

شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں، آباد

معقول انعام دیا گیا5۔

نوٹ نمبر1- ہسٹری آف جہانگیر مصنفہ بنی پرشاد ایم۔ اے اور تاریخ ہند اسمتھ۔ 12

نوٹ نمبر2- استخراج از جہاں آرا۔ مصنفہ کلیم

نوٹ نمبر3- لیٹر مغل ولیم ارون=12

نوٹ نمبر4- ظفر نامہ۔ سیر=12

نوٹ نمبر5- سیر=12

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے لیے شاہی نذرانہ
''گل محمدی''

اس پُر مسرت موقع پر نذر نواز بادشاہ کا ایک مخصوص نذرانہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ ایک گلکار، طلائی، مرصع اور بے عدیل قندیل تھی۔ موسومہ ''گل محمدی'' جو روضۂ مطہرۂ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم پر آویزاں کرنے کے لیے مدینہ طیبہ کو بھیجی گئی تھی 1۔ خصوصیت ذکر کی وجہ یہ کہ اس سے بھی شاہجہاں کے حسن مذاق، اس کی سلیم الطبعی اور ندرت پسندی اور نہ محض ندرت پسندی بلکہ نکتہ نوازی کا اندازہ ہوسکتا ہے اور اہل نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ کس طرح بات بات میں شاہجہاں کی طبیعت اعجوبۂ روزگار لطائف پیدا کر دیتی تھی اور اس کے بعد ہمیں کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں دکھائی دیتی کہ تخت طاؤس یا تاج محل کے متعلق بیان کریں کہ ان کی ترتیب وضع کا خاکہ شاہجہاں کی فکر کا نتیجہ تھا۔

گل محمدی۔ 1057ھ = 21 جلوس میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ قطب الملک (والی گولکنڈہ) کے تعلقہ ''سورت'' میں کسی کان سے 180 (ایک صد اسی) رتی وزنی ایک ناتراشیدہ الماس برآمد ہوا ہے۔ حکم ہوا کہ قطب الملک کو لکھا جائے ''الماس مذکور کی قیمت، وجہ مقرری (خراج) میں مجرا دے کر حضور میں بھیج دے'' فرمان شاہی کے پہنچنے سے پہلے قطب الملک اس الماس کو الماس تراش کے حوالہ کر چکا تھا۔ اور وہ دس رتی تراش بھی چکا تھا۔ فرمان شاہی کے پہنچتے ہی اس نے اسے بجنسہٖ روانہ کر دیا۔ حضور میں پہنچ کر ستر (70) رتی اور تراشا گیا۔ اور اب سو (100) رتی بے جرم، شفاف و خالی از عیب باقی رہا۔ جس کی قیمت 1½ لاکھ روپیہ آنکی گئی اور بیس ہزار روپیہ اس کے ریزہ ہائے تراشیدہ کی۔ اسی زمانہ میں اتفاقاً ایک دن ایک شمامہ عنبر نذر گزرا جو قندیل نما ستر (70) تولہ وزنی اور دس ہزار روپیہ قیمت کا تھا۔ بادشاہ نے اس شمامہ کو طلا میں مشبک کرا کے انواع اقسام کے جواہرات مع اس سورتی الماس اور اس کے ریزوں کے اُس پر جڑوا دیے۔ اس طرح یہ قندیل 2½ لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی اور چونکہ اس کی گلکاری خوب اور بہت ہی

دیدۂ زیب تھی۔ لہٰذا اس نام سے موسوم ہوئی 2۔

قندیل مذکورہ بالا کے ساتھ بقول صاحب ظفر نامہ چھتر ہزار روپیہ نقد اور چھتر ہزار روپیہ کی جنس احمد آباد سے خرید کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو سید احمد سعید کے ہاتھ روانہ کی۔ اجناس مذکور وہاں وہ چند قیمت کو بکتی تھیں لہٰذا حکم ہوا کہ شریف مکہ کو نقد و جنس پچاس ہزار روپیہ کی دے اور بقیہ روپیہ مساکین و مستحقین پر تقسیم کر دے۔ قندیل کو روضہ منورۂ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم میں آویزاں کر دے 2۔

نوٹ نمبر 3,2,1- سیر ظفر نامہ=12

صاحب ظفر نامہ کے ایک قول کی تنقید

ترسیل نقد و جنس میں صاحب ظفر نامہ شاہجہاں اور صاحب سیر المتاخرین کے مابین قدرے اختلاف ہے۔ صاحب سیر کا بیان یہ ہے:

حکم ہوا کہ متصدیان گجرات ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کا سامان خرید کر اس (سید موصوف) کے حوالہ کریں۔ تاکہ وہ اس میں سے پچاس ہزار کا سامان مع منافع شریف مکہ کو دے اور ساٹھ ہزار کی جنس فروخت کر کے مع منافع مستحقین مکہ معظمہ کو اور پچاس ہزار روپیہ کے سامان کی نقدی منافع سمیت ارباب استحقاق مدینہ طیبہ کو تقسیم کرے"۔

ہم صاحب سیر کی رائے سے اس لیے متفق ہیں کہ اُس کے بیان کے مطابق ہر دو مقامات مقدسہ کے اہل استحقاق کی امداد ثابت ہے۔ علاوہ ازیں یہ ممکن نہیں کہ بادشاہ خانۂ خدا کے ہمسایوں کی خدمت گزاری کرتا اور جوار رسول کے باشندگان کو نظر انداز کر جاتا۔

شاہان مغلیہ عملاً حامل خیال تجارت تھے

شاہجہاں کا سامان بھیج کر اس کی فروختگی، حصول منفعت، زر اصل و نفع کے تقسیم کی ہدایت کرنا یہ ایسے امور ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے بادشاہ بھی تجارتی خیالات سے پُر تھے۔

شاہجہاں کی معزولی و نظر بندی

دنیا دار المکافات ہے، بیک گردش چرخ نیلوفری خود صاحقران ثانی تیس برس حکومت کرنے کے بعد، تقریباً سرسٹھ (67) برس کی عمر میں 21 رمضان المبارک 1067ھ (1658) کو اپنے منجھلے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں ''مصالح ملکی'' کا شکار ہو کر قلعہ آگرہ میں نظر بند اور منصب حکومت سے معزول و محروم ہو گیا1۔ اس پُر عبرت واقع کی تاریخ عاقل خان نے جو ایک مشہور معروف مورخ و تاریخ گو ہوا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار میں (1068ھ) پائی2۔ سچ ہے

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ — تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے چلے گئے (آتش)

نوٹ نمبر 1- سیر اورنگ زیب سرکار۔ وقائع برنیر۔ 12

نوٹ نمبر 2- حواشی وقائع سیاست برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب بحوالہ تاریخ عاقل خاں و صاحب عمل صالح = 12

جلوس عالمگیری

گو اورنگ زیب کی سرسری و رسمی تاجپوشی کی تقریب باغ اعز آباد عرف شالامار میں جو شاہجہاں آباد (دہلی) کے قریب لاہور کے راستہ پر تھا، یکم ذی قعدہ 1067ھ مطابق 21 جولائی 1658 کو جمعہ کے دن عمل میں آ چکی تھی1۔ لیکن چونکہ بھائیوں کی طرف سے اطمینان کلی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ایک شاندار دربار، جشن، تعین لقب، اجرائے خطبہ و سکہ وغیرہ کہ لوازمات شاہی ہیں صورت پذیر نہ ہوئے تھے2۔ بھائیوں کے استیصال کے بعد ہر طرف سے مطمئن ہو کر بروز دوشنبہ 24 رمضان 1069ھ مطابق 5 جون 1659 کو قلعہ دہلی (جس میں یہ اب تک داخل نہیں ہوا تھا3) میں نجومیوں کے قرار دادہ مہورت کے موافق بعمر 40 سال 7 ماہ 13 دن بحساب شمسی (41 سال 2 ماہ 10 دن بحساب قمری) بڑے کروفر کے ساتھ تخت طاؤس پر دوبارہ باقاعدہ جلوس کیا4۔ ''ابوالمظفر، محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر5، عالمگیر غازی6'' لقب قرار پایا۔ ملا عزیز اللہ خلف ملا محمد تقی مجلسی اصفہانی نے آیۂ کلام اللہ ''ان الملک للہ یؤتیہ من یشاء'' کے

حروف ملفوظی سے تاریخ جلوس نکالی 7، جسے حقیقتاً القائے ربانی والہام غیبی سمجھنا چاہیے۔ سکہ سخن نواز اور سخن سنج بادشاہ نے خود کہا۔

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر 8

اور بے ادبی کے خیال سے سکے میں کلمہ طیبہ اور خلفائے اربعہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم و رضوا عنہ) کے اسمائے مبارک کی بجائے سونے اور چاندی کی مناسبت سے باختلاف لفظ "بدر" و مہر کا ٹھپہ ہونا تجویز ہوا۔ 9

نوٹ نمبر 1و2۔ اورنگ زیب سرکار۔ حواشی سفر نامہ برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب مستخرجہ از تاریخ عاقل خاں و عمل صالح و حاشیہ مترجم انگریزی سفر نامہ برنیر (مسٹر اونگ برک) بحوالہ تاریخ ہندوستان مصنفہ کرنل وڈ

نوٹ نمبر 3۔ عالمگیر نامہ و سیر = 12

نوٹ نمبر 4و5۔ حواشی وقائع سیاحت برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب = ۲۱

نوٹ نمبر 6و8۔ عالمگیر جس وقت اورنگ زیب نے دارا شکوہ کی فوج کو عماد پور عرف سموگڈھ کے مقام پر سب سے پہلی شکست دینے کے بعد آگرہ کے قریب باغ نور منزل عرف باغ ذہرہ پر قیام کیا اور باپ بیٹوں میں خط وکتابت شروع ہوئی ہے۔ تو شاہجہاں نے اس کو ترغیب وتہدید کر کے اپنی خدمت میں حاضری پر آمادہ کرنا شروع کیا اور بقول عاقل خاں و صاحب عمل صالح وہ تیار بھی ہو گیا تو دوسرے دن بادشاہ نے بطور اظہار خوشنودی مزاج اس کو عمدہ اور نفیس اشیا بھیجیں۔ منجملہ ان کے ایک تلوار موسومہ "عالمگیر" بھی تھی۔ امرا نے اورنگ زیب کو بادشاہ کی طرف سے خوف زدہ اور غیر مطمئن کر کے جانے سے روکا اور اس تلوار کو فال نیک بتلایا تا آنکہ اس نے تخت نشینی کے وقت اس لفظ کو اپنے القاب شاہی کا ایک جزو بنالیا۔ (از حواشی سفر نامہ برنیر مترجمہ خلیفہ سید محمد حسین صاحب صفحہ 124-125)

نوٹ نمبر 7-9۔ حواشی "وقائع سیاحت برنیر" مترجمہ خلیفہ محمد حسین و سیر-12

ایک روایت

روایت: کہتے ہیں جب خطیب دستور کے موافق دوران خطبہ خوانی اورنگ زیب کے بزرگوں میں سے کسی کو جنت آشیانی اور کسی کو خلد مکانی وغیرہ وغیرہ کہہ کر گننے لگا اور جہانگیر کے نام

پر پہنچا تو اورنگ زیب نے اپنی خلقی دانائی اور فطری فراست سے معلوم کیا کہ یہ اس امر میں حیران ہے کہ جیتے جاگتے شاہجہاں کا نام کیا کہہ کرلے،فوراً قیدی باپ کے حسب حال لقب لطیف تجویز کر کے خطیب سے کہا'' بگو! تارک تاج و دیہم ثانی سلطان ابراہیم،شہاب الدین محمد شاہجہاں، بادشاہ غازی،صاحبقران ثانی''

اس روایت کے متعلق خلیفہ محمد حسین صاحب نے صفحہ 169 حواشی وقائع سیاحت برنیر مترجمہ خود میں تحریر فرمایا ہے۔

''اگر چہ کسی کتاب تاریخ میں دیکھا نہیں گیا مگر مشہور ہے''

کچھ تعجب بھی نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مخالفین اورنگ زیب نے اپنی بت طرازی کا ثبوت دیا ہو۔

یہ دربار بڑا ہی شاندار دربار تھا۔ برنیر نے اس دربار کو دیکھا تھا۔اس نے جو چشم دید کیفیت اپنے وقائع سیاحت میں قلم بند کی ہے۔اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مبہوت و مرعوب ہو گیا ہے۔وہ اس کیفیت کو لکھنا چاہتا ہے مگر ڈھونڈے لفظ نہیں ملتے۔اور ہے بھی یہ کہ شاہان مغلیہ کے جشنوں اور درباروں میں یہ جشن و دربار اپنی نظیر آپ ہی تھا۔جس میں اکبری جاہ و جلال، جہانگیری عیش وعشرت شاہجہانی نفاست اور عطایا ونوال کی مجموعی جھلک پائی جاتی تھی۔ڈاکٹر مذکور کا بیان ہے:

''وہ بڑا جشن جولڑائی کے اختتام کے بعد ہوا تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی تماشا میں نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔اس روز بادشاہ نہایت ہی عمدہ لباس پہنے دیوان عام و خاص کے صدر میں مرصع تخت (تخت طاؤس) پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔اس کی پوشاک نہایت نازک اور پھول دار ریشمی کپڑے کی تھی جس پر بہت ہی عمدہ زری کا کام کڑھا ہوا تھا۔اور زری کا رمندیل سر پر تھی اور بڑے بڑے اور نہایت قیمتی ہیروں کا طرہ لگا ہوا تھا۔جس میں ایک پکھراج ایسا تھا جو لاثانی کہا جاسکتا ہے۔اور آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔اور بڑے بڑے موتیوں کا کنٹھا گلے میں تھا۔جو ہندوؤں کی طرح پیٹ تک لٹکتا تھا۔

تخت کے نیچے کے چبوترے پر جس کے گرد چاندی کا کٹہرا لگا ہوا تھا اور اوپر زری کی جھالر کا ایک پُر زر وسیع شامیانہ تنا ہوا تھا۔ امرا نہایت مکلّف پوشاکیں پہنے کھڑے تھے۔ مکان کے ستون زربفت سے منڈھے ہوئے، ریشمی مشجر کے شامیانے جن میں ریشم اور زری کے پھندنے لگے ہوئے تھے تنے ہوئے اور نہایت عمدہ ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے اور باہر ایک خیمہ جسے ''اسپک'' کہتے ہیں اور جو اس مکان سے بھی بڑا ہے اس کی چھت کے ساتھ ملا کر لگایا تھا، جو صحن کے نصف تک پھیلا ہوا اور چاروں طرف چاندی کی پتیوں سے مندھے ہوئے کٹہرے سے گھرا ہوا تھا اور چوبیں بھی چاندی سے منڈھی ہوئی تھیں جن میں سے تین ایسی بلند تھیں جیسے جہاز کا مستول، اور باقی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس عالیشان خیمے کے باہر کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی۔ جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور جس کے بیل بوٹے ایسے موزوں اور رنگ ایسے تیز و شاداب تھے کہ ایک تختہ گلزار معلوم ہوتا تھا۔ اور چونکہ سب امرا کو حکم دیا گیا تھا کہ عام و خاص کی غلام گردش کی ایک ایک محراب کی زیبائش و آرائش وہ اپنے اپنے خرچ سے کریں۔ اس لیے بادشاہ کی زیادہ تر رضا مندی حاصل کرنے کے خیال سے ہر ایک نے دوسرے سے بڑھ کر ان کی زیب و زینت میں کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام درو دیوار سر سے پاؤں تک کمخواب اور زربفت میں غرق اور فرش نہایت بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ ہو گیا۔

جشن کے تیسرے دن اول بادشاہ اور اس کے بعد اکثر امرا بڑے تکلف کے ساتھ بڑی بڑی ترازوں میں جن کے پلڑے اور بٹے سونے کے تھے۔ تولے گئے اور مجھے یاد ہے کہ یہ دیکھ کر کہ اورنگ زیب کا وزن سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک سیر زیادہ ہے، تمام دربار نے نہایت ہی مسرت ظاہر کی۔ اس قسم کے جشن ہر سال ہوتے ہیں۔ لیکن اس شان و شوکت کا جشن کبھی نہیں ہوا اور نہ اس قدر کبھی خرچ ہوا[1]۔

نوٹ نمبر 1۔ وقائع سیاحت برنیر=12

اورنگ زیب کا قصد ترصیع مکرر "تخت طاؤس"

قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ تو وہ اپنے پیش رو کے نظام میں تھوڑا بہت تغیر وتبدل ضرور کیا کرتا ہے۔ چنانچہ عالمگیر نے بھی زمام حکومت ہاتھ میں لے کر کاروبار سلطنت میں ترمیم وتنسیخ کرنی شروع کی۔ اسی سلسلے میں اس نے تخت طاؤس کے کام میں بھی کچھ ردوبدل کرنا چاہا۔

ارادۂ ترصیع مکرر پر شاہجہاں کی ناراضی

اور

عطائے جواہرات سے انکار

بہت ممکن اور قرین قیاس ہے کہ اس معاملہ میں اورنگ زیب کی یہ مصلحت بھی ہو کہ اس بہانے سے مقید بادشاہ کے قبضے میں جو بہت سے بیش قیمت اور یکتائے روزگار جواہرات موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ جواہر ہاتھ آ جائیں۔ لہٰذا طلب جواہرات کے متعلق باپ کے پاس پیام بھی بھیجا۔ قیدی بادشاہ اس زمانہ میں فرماں روا بیٹے سے بے حد برہم تھا۔ اس نے نہایت غضبناک ہو کر کہلا بھیجا "اورنگ زیب! دیکھ! دانائی وانصاف سے سلطنت کا کام کرتا رہ، تخت کے معاملہ میں ہرگز ہرگز دخل مت دیجیو!!! اگر جواہرات کے متعلق تو نے دوبارہ ستایا تو یاد رکھیو ان سب کو کوٹ کر چورا کرادوں گا!!!" 1

ٹیورنیر نے تو یہ بھی لکھا ہے "غصے میں آ کر شاہجہاں نے یہ چاہا تھا کہ تمام جواہرات کو پسوا ڈالے۔ لیکن بیگم صاحب (جہاں آرا بیگم) نے سمجھا بجھا کر اسے اس ارادہ سے باز رکھا اور وہ جواہرات اس (شاہجہاں) سے لے کر اپنی تحول میں رکھ لیے۔ 2

آخر کار شاہجہاں نے اورنگ زیب (عالمگیر) کی خدمت گزاری سے خوشنود ہو کر اس کا قصور نہ صرف زبانی ہی معاف کیا۔ بلکہ توقیع معافی لکھ دی تھی۔ 3 بیٹے کو امور سلطنت میں مشورہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ 4 جہاں زیب 5 بانو بنت داراشکوہ کا عقد بھی محمد اعظم المخاطب بہ عالی جاہ کے ساتھ کر دیا تھا۔ 6 جس کے متعلق پہلے بڑے شدومد کے ساتھ انکار کر چکا تھا۔ اور اورنگ زیب

کے مطلوبہ جواہرات میں سے کچھ جواہر بھی اسے دے دیے تھے 7۔ بقول برنیر علاوہ ان تمام امور کے" اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی تھی۔"

نوٹ نمبر 1۔سفرنامہ برنیر اور" جہاں آرا"=12

نوٹ نمبر 2- جہاں آرا=12

نوٹ نمبر 3- مآثر الامرا=12

نوٹ نمبر 4-سفرنامہ برنیر=12

نوٹ نمبر 5- جہاں زیب بانو بیگم-داراشکوہ کی بیٹی تھی۔ جب وہ داراشکوہ کے قتل کے بعد محل سرا میں لائی گئی تو شاہجہاں اور جہاں آرا بیگم نے اس کی بڑی دلدہی و غمخواری کی اور بہت محبت و شفقت سے پرورش کرنا شروع کیا۔ آخر کار بیگم صاحب نے اس کو بیٹی بنا کر متبنی کر لیا۔

جب یہ شہزادی عالم شباب کو پہنچی تو عالمگیر نے خواہش کی کہ وہ محمد اعظم المخاطب بہ عالی جاہ کو بیاہ دی جائے۔لیکن شاہجہاں اور بیگم صاحب نے جو اس کے اصلی سرپرست تھے شدومد کے ساتھ اس امر کی مخالفت کی۔ خود ستم رسیدہ جہاں زیب نے جب سنا تو کہا" میں اس ظالم کے لڑکے سے جس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے ہرگز شادی کرنے پر رضامند نہیں" مگر بادشاہ وقت کی مخالفت کہاں تک چل سکتی تھی۔ آخر کار جہاں آرا بیگم اور شاہجہاں دونوں رضامند ہو گئے اور 1078ھ میں شادی ہو گئی۔ بزم شادی بیگم صاحب کے دولت خانہ پر منعقد ہوئی۔ بیگم صاحب نے اس تقریب میں اعلیٰ درجے کا انتظام کیا تھا اور سولہ لاکھ (1600000) روپیہ اپنی جیب خاص سے صرف کر ڈالا تھا۔

7۔ربیع الاول 1080ھ میں جہاں زیب بانو کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جو بیدار بخت کے نام سے مشہور ہوا۔ 9 جمادی الاول 1085ھ میں دوسرا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سکندر شاں رکھا گیا۔ لیکن اس نے 1087ھ میں ماں باپ کو داغ جدائی دیا۔

دکن میں تھی کہ 1096ھ میں اس کی پستان کی جڑ میں ایک دانہ پیدا ہوا۔ بہت کچھ علاج معالجہ کیا گیا۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔ ضخامت اور سوزش دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ ایک ڈاکٹر طلب کیا گیا اس نے ایک لیڈی

ڈاکٹر کے لیے جو دارالخلافہ میں موجود تھی بلانے کا مشورہ دیا۔ تاکہ اس کی مدد سے علاج کرے۔ حسب الطلب لیڈی ڈاکٹر پہنچی۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ وہ شراب پیتی ہے بیگم موصوفہ الصدر نے باوجودیکہ اسے بہت سمجھایا بجھایا گیا۔ گوارا نہ کیا کہ وہ اس کے جسم کو ہاتھ لگائے اور اسی وجہ سے اس ڈاکٹر کا علاج نہ ہو سکا۔

وہ دو سال تک علیل رہ کر 8-ذی قعدہ 1096ھ کو حیدر آباد میں رہگرائے عالم باقی ہوئی۔ لاش حیدر آباد سے منتقل ہو کر دہلی لائی گئی۔ جہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جوار میں دفن کی گئی۔ دو لاکھ روپیہ انتقال نعش، خیرات اور تجہیز و تکفین میں صرف ہوا۔

جہاں زیب بانو بیگم نہایت درجہ حسین ماہ پیکر اور نازک مزاج شاہزادی تھی۔ ساتھ ہی اس کے نہایت دلیر اور بہادر عورت۔ صفت بہادری میں اس خاندان کی کوئی عورت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ وہ محمد اعظم کے ساتھ اکثر لڑائیوں کے موقعوں پر ہمراہ رہا کرتی تھی۔ اور نازک ترین مواقع پر اپنی فوج کو مدد دیا کرتی تھی 1095ھ میں جب سردارانِ بیجاپور نے محمد اعظم کا کئی ہزار سواروں سے محاصرہ کیا ہے تو شاہی فوج کی یہ حالت دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی اور فوراً تیر اندازی شروع کر دی۔ اس طرح اس بہادر عورت نے غنیم کے لشکر کے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا۔ اسی کے ساتھ جو امرا بددل ہو رہے تھے ان کی ڈھارس بھی بندھاتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ پامردی بروقت بہت مفید ثابت ہوئی۔ (ماخوذ از جہاں آرا) 12

نوٹ نمبر 6 و 7- جہاں آرا۔ سفر نامہ برنیر = 12

ترصیع مزید

صریحی طور پر تحقیق نہ ہو سکا کہ اورنگ زیب نے ان جواہرات کے حاصل ہونے سے قبل تخت طاؤس پر ترصیع مزید کرائی یا بعد میں لیکن یہ امر محقق ہے کہ اس نے اپنے اوائل عہد حکومت میں 1 ایمنا کے زیر اہتمام اس تخت پر کچھ اور جواہرات وغیرہ جڑوا کر بقول صاحب ماثر الامرا "(پرانے تخمینہ کے موافق) تخت مذکور کی قیمت ایک کروڑ روپیہ سے بڑھا دی۔"

نوٹ نمبر 1 - مجھے نہایت افسوس ہے کہ باوجود تلاش بسیار اس شخص کے مزید حالات کی اطلاع نہ ہوئی۔

تخمینہ ٹیورنیر کی صحت کی دلیل مزید

چونکہ ٹیورنیر نے تخت طاؤس کو بعد ترصیع مزید دیکھا تھا، اس لیے بھی بمقابلہ دوسرے مورخین وسیاحان ماسبق کے ہماری رائے میں اس کا اندازۂ مصارف زیادہ وقیع، قابل ترجیح اور قرین صحت ہے۔

''کوہ نور'' تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں تعبیہ تھا یا نہیں؟

چیمبرس انسائکلو پیڈیا (مطبوعہ ومنشورۂ لندن) کی اشاعت جدید میں ''ڈائمنڈ و الماس'') کے بیان میں ''کوہ نور'' کی مختصر تاریخ دیتے ہوئے لکھا ہے۔

اورنگ زیب نے اس کو تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں جڑوا دیا تھا''

رسالہ ''حسن'' حیدرآباد (دکن) کی جلد چہارم نمبر 11 میں مولانا تمنائی نے حقیقت الماس کے عنوان سے ایک قابل قدر علمی وتاریخی مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے تذکرۂ کوہ نور کے ضمن میں تحریر کیا ہے:

''اورنگ زیب کے پررعب زمانہ میں مسٹر ٹیورنیر ایک فرانسیسی مشہور سیاح نے 2۔ نومبر 1665 کو دوسرے شاہی جواہرات اور قیمتی اشیا کے ساتھ کوہ نور کے دیکھنے کی بھی عزت حاصل کی تھی۔ اس سے پہلے کسی یورپین آنکھ کو کوہ نور کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ گویا اورنگ زیب کی ایک غیر معمولی عنایت تھی جو اس نے ٹیورنیر کو ہاتھ میں لے کر کوہ نور کو دیکھنے اور تولنے کا موقع دیا''

مولانا تمنائی کے بیان سے فی الجملہ چیمبرس انسائکلو پیڈیا کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر کوہ نور تخت مذکور کے طاؤس کی آنکھ میں تعبیہ ہوتا تو ٹیورنیر کو اسے تولنے کا موقع نہ ملتا ادھر ہماری تحقیقات کے مطابق (جو ''ایجوکیشنل گزٹ'' لکھنو بابت جنوری، فروری 1925 میں بعنوان الماس شائع ہوئی اور) جس کی تائید مذکورہ بالا انسائکلو پیڈیا سے بھی ہوتی ہے کوہ نور اور مغل اعظم نامی ہیروں کے حالات کو اکثر مورخین نے اس بری طرح خلط ملط کیا ہے کہ ایک دوسرے میں فرق وتمیز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ ٹیورنیر نے کوہ نور کو تولا تھا بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس نے مغل اعظم کو تولا تھا، جس سے مولانا تمنائی کے بیان کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔

چیمبرس انسائکلو پیڈیا کا یہ بیان بھی کہ کوہ نور کو اورنگ زیب نے تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں جڑوا دیا تھا۔ واقعات کے خلاف اور صحت سے کوسوں دور ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مور دو نہ تھے بلکہ ایک تھا اور یہ امر جمہور مورخین کے خلاف ہے۔ اگر مور بھی ایک ہی فرض کر لیا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مغل بادشاہ جس کو اپنی خاندانی رسم اور اپنے عہد کے مروجہ طرز تعمیر کو مدنظر رکھتے ہوئے پابند نظیر ہونا چاہیے تھا۔ کیونکر پسند کرتا کہ مور کی ایک آنکھ تو کوہ نور سے منور ہو جائے اور دوسری بے نور رہے اور اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ دوسری آنکھ میں بھی الماس مذکور کے قد و قامت، وضع قطع اور رنگ روپ کے ہم شکل ایک دوسرا ہیرا لگا کر دونوں آنکھیں روشن کر دی گئی تھیں تب بھی مور کے جثے اور اس کے تناسب و موزونیت کا خیال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کا ½186 (یا1861/16) قیراط 3 وزنی ہیروں کا متحمل ہونا اور ان سے اس کے حسن و خوب صورتی میں فرق نہ آنا قرین عقل نہیں کیونکہ وہ طاؤس یونانی خرافیات کا کوئی بڑے بڑے دیدوں والا دیو نہ تھا۔

چیمبرس انسائکلو پیڈیا کے سوا کسی اور کتاب میں یہ امر نظر سے نہیں گزرا، اگر اس کی کچھ اصلیت ہوتی تو عالمگیر نامہ اور سیر المتاخرین میں سے کسی ایک میں اس کا تھوڑا بہت تذکرہ ضرور ہوتا اور اگر ان کے مصنفین بھی غضِ بصر کر جاتے تو کم از کم صاحب "ماثر الامراء" کو جس نے ترصیع مکرر پر روشنی ڈالنے میں اہتمام کیا ہے۔ اس اہم واقعہ کے قلم بند کرنے میں اعراض نہ ہوتا، علی الخصوص ڈاکٹر برنیر جو اورنگ زیب کے ابتدائی دور حکومت میں عرصے تک اس کا طبیب خاص اور درباری رہا ہے کچھ نہ کچھ اس کے متعلق ضرور لکھتا۔ کیونکہ اس نے اپنے سفر نامہ میں اپنے زمانۂ موجودگی کی اورنگ زیبی ترمیم و تنسیخ پر برابر تبصرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں بعض بعض مورخین و محققین کے بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کوہ نور وغیرہ جیسے نادر جواہرات شاہجہاں کے عین حیات خود اسی کے قبضہ میں رہے اور اورنگ زیب کو اس کی وفات کے بعد ہاتھ آئے۔ چنانچہ کتاب جہاں آرا کے مصنف نے لکھا ہے:

جب شاہجہاں کا انتقال ہوا اور عالمگیر برسم تعزیت بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو

موصوفہ نے ایک طشت زرین پیش کیا جو گراں بہا جواہرات سے مملو تھا۔ اس میں اکثر وہ جواہرات تھے جن پر شاہجہاں کو ناز تھا۔

ایسی صورت میں اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کی وفات کے بعد کوہ نور کو تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں جڑ وا دیا تھا اور وہ اس طرح تعبیہ کیا گیا تھا کہ بآسانی نکالا بھی جاسکتا تھا اور مسطورہ بالا اعتراضات سے بھی قطع نظر کر لیں تب بھی چیمبرس انسائکلو پیڈیا کی تحریر صحیح ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ شاہجہاں نے 1666 میں رحلت کی ہے اور ٹیورنیر کو 1665 میں چغتائی نوادر و عجائبات کی سیر کا موقع ملا ہے۔

نوٹ نمبر 1- کوہ نور۔ (دیکھو حاشیہ نمبر 4 از حواشی صفحہ 162)

نوٹ نمبر 2- مغل اعظم۔ یہ ہیرا 1650 میں کلور کی معدن سے جو علاقہ گولکنڈہ میں پرتیال سے 24 میل کے فاصلہ پر واقع ہے برآمد ہوا تھا۔ بظاہر میر جملہ کے ہاتھوں سلاطین مغلیہ تک پہنچا۔ یہ مدور گلاب نما تراشا گیا تھا۔ اس کا وزن 280 قیراط تھا۔ اس پر بعض مورخین نے کوہ نور کا دھوکا کھایا ہے۔ 1739 میں دلی کی لوٹ مار کے موقع پر اسے نادر نے توڑ ڈالا اور یہ درطۂ گمنامی میں پڑ گیا۔ اس کا یہ نام انگریزی تاریخوں میں گریٹ مغل دیکھنے میں آیا ہے۔ جس کا یہ ترجمہ کیا گیا۔ میرے خیال میں وہ ہیرا ہے جو اس زمانہ میں ''کوہ طور'' کہلاتا تھا۔
(ایجوکیشنل گزٹ فروری 1925 میں شائع شدہ ذاتی مضمون ''الماس'' سے اخذ کیا گیا)

نوٹ نمبر 3- قیراط۔ معرب ہے ''کریٹ'' سے جو یونانی لفظ ہے ''کیرب (Carab) سے بنا ہے یہ مٹر کے برابر اور اس سے مشابہ ایک پھل تھا۔ جو گھونگچی کی طرح سونا اور جواہرات جیسی بیش قیمت اشیا تولنے کے کام آتا تھا۔ شدہ شدہ یہ ایک وزن خاص کا نام ہو گیا جو چار گرین کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا وزن مختلف ممالک میں مختلف ہوتا ہے۔ بین الملی (انٹرنیشنل) وزن 3/1/6 گرین کے برابر ہے۔ ہمیں قیراط کو رتی کے برابر تصور کرنا چاہیے (المنجد مطبوعہ بیروت اور نوا اینٹی انگلش ہسٹری وہسٹری ڈکشنری)=12

رحلت شاہجہاں

وہ شاہجہاں جس نے جامع مسجد (دہلی) بنوائی، وہ شاہجہاں جس نے تاج محل (آگرہ) کی تعمیر کی، وہ شاہجہاں جس نے دلی کو نئے سرے سے ترتیب دیا، وہ شاہجہاں جس نے

تخت طاؤس پر جلوس کیا اور جلوس بھی وہ جلوس کہ جس کے باعث رعب وسطوت شاہی کا دریا حاضرین دربار کے قلوب میں لہریں لینے لگا۔ وہ شاہجہاں جو اس عالم میں بھی اپنے خدا کو نہ بھولا۔ مگر وہ شاہجہاں جس نے حصول سلطنت میں اپنے خاندان کے کتنے ہی چشم و چراغ بجھائے دنیا سے جاتا ہے تو کس طرح؟ دارالمکافات کی ایک تصویر مجسم بن کر۔ عمر کا آخری حصہ ہے، ایک مسجد کا حجرہ ہے، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور ہُو کا عالم ہے، آٹھ سال تک قید اورنگ زیبی میں جھینک جھینک کر سسک سسک کر وقت کی آخری گھڑیاں ختم ہوتی ہیں۔ اور یہ مجبوریوں کا شکار و نیرنگی عالم کا مجسمہ تارک اورنگ و دیہیم، ثانی ابراہیم اس گوشۂ گمنامی میں 26 رجب المرجب 1076ھ = 1666 کو اپنی رفیقۂ حیات ممتاز محل کے مقبرے پر آنکھیں جمائے ہوئے ایک آخری سانس لیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ط

مرزا محمد کاظم (صاحب "عالمگیر نامہ") نے اس پر عبرت واقعہ کی ایک معنی خیز تاریخ کہی جو یہ ہے۔

چوں شاہجہاں خدیو قدسی ملکات　　برخاست بعزم عقبیٰ از تخت حیات
جستم از عقل سال تاریخش　　گفتا خردم "شاہجہاں کرد وفات"

1076ھ

"اورنگ زیب" کا "آگرہ" آنا اور بہن کے ساتھ ہمدردی

اورنگ زیب نے جس وقت دہلی میں باپ کے مرنے کی خبر سنی تو اس زور سے دھاڑیں مار مار کر رویا کہ تمام سامعین و اہل دربار کے دل بھر آئے اور فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا1۔ جہاں آرا بیگم نے اس کی آمد آمد کی خبر پا کر بڑی سرگرمی کے ساتھ استقبال کا اہتمام کیا، تمام قلعہ آراستہ کیا گیا اور موتی مسجد2 کمخواب کے تھانوں سے مزین کی گئی3۔ اورنگ زیب

''آگرہ'' پہنچ کر قلعہ کے باہر داراشکوہ کی حویلی میں فروکش ہوا اور دوسرے دن بیگم صاحبہ کے پاس تعزیت کی غرض سے گیا اور اس کے بعد بھی اس نے کئی مرتبہ دل شکستہ بہن کے یہاں جا کر اس کی تسلی وتشفی کی 4۔ اس زمانہ میں وہ بیگم صاحبہ سے اس قدر خوش ہوا کہ ایک دن تمام درباریوں، امراؤ اعیان سلطنت کو حکم دیا کہ وہ سب ممدوحہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر نذریں پیش کریں 5

لوٹ نمبر 1و3 تا 5–جہاں آرا اور سفرنامہ برنیر=12

لوٹ نمبر 2–موتی مسجد۔(دیکھو حاشیہ نمبر 5 صفحہ نمبر 90)

تخت طاؤس کا ضرورتاً آگرہ پہنچنا

اسی قیام کے دوران میں ''عیدالفطر'' آئی اور اورنگ زیب ایک بلند وخوب صورت ہاتھی پر سوار ہو کر جامع آگرہ میں نماز کے لیے گیا۔ بعد ادائے دوگانہ عید اس نے نہایت دھوم دھام کے ساتھ دربار کیا۔ اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ تخت طاؤس پر جو کچھ عرصہ پیشتر اسی غرض سے آگرہ منگالیا گیا تھا جلوس کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس تخت پر دارالخلافہ آگرہ میں رونق افروز دربار ہوا 1

مذکورہ بالا جشن عید سعید تین دن تک منایا گیا۔ اس موقع پر اورنگ زیب نے ایک لاکھ اشرفیاں بیگم صاحبہ کو نذر کیں اور ان کی جاگیر میں اضافہ کر کے انھیں ''بادشاہ بیگم'' کے خطاب سے معزز فرمایا 2

لوٹ نمبر 1و2– جہاں آرا اور سفرنامہ برنیر=۲۱

دولت مغلیہ کی حالت زار

اورنگ زیب کے بعد اورنگ گورگانیہ کو کوئی ایسا بادشاہ میسر نہیں آیا جس کو اسلاف تیموریہ کی طرح تاج شاہی زیب دیتا۔ مغل بادشاہ بجائے ''شہنشاہ مغل'' کے ''بندۂ عیش'' رہ گئے۔ نہ کسی میں ہمایوں کی سی جفاکشی رہی نہ اکبری اولوالعزمی، نہ کسی میں جہانگیر کا اقبال باقی رہا نہ شاہجہانی جو ہر مردم شناسی وللہیت اور نہ اورنگ زیب کا تدبر۔ قصہ مختصر اسلاف کی بنائی ہوئی شاہراہ

حکومت پر رخش حکمرانی کو جولاں کرنے کا سلیقہ ہی نہ رہا۔ خیالات کی پستی، علو ے ہمتی کے فقدان اور عقل کی تیرگی کا جلوہ ہر ہر شے میں نظر آنے لگا۔ تاہم محمد شاہ المعروف بہ رنگیلا کے عہد سلطنت تک خانہ زادانِ قدیم کاروبارِ سلطنت سنبھالے ہوئے تھے اور بادشاہ اپنے آبائی تحائف و نفائس اور خاندانی خزائن و دفائن پر قابض و متصرف تھے۔ جس کے باعث ان کی ظاہری شان و شوکت میں کمی نہ آنے پائی تھی۔ مگر درحقیقت مغلیہ رعب، سطوت، نہیب و ہیبت عرصہ ہوا کہ ختم ہو چکا تھا اور نظام سلطنت مختل۔ ہر طرف اضمحلال و انحطاط نمودار تھا۔ صوبہ دار خودسر ہو گئے تھے۔ اور مرکزی حکومت کا قبضہ ان پر برائے نام بھی نہیں رہا تھا، بادشاہ تھا مگر "شاہ شطرنج" کہ کٹ پتلی کی طرح ذی اختیار منصب داروں کے ہاتھ میں کھیلتا تھا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ بغاوتیں رونما ئیں، شورشیں پھیلیں اور بالاتر غضب یہ ہوا کہ "مغلانِ سلف" نے جن اغیار کو جانکاہ کوششیں اور حوصلہ شکن محنتیں کر کے اتنا مرعوب و خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ آنکھ بھر کر "سلطنت مغلیہ" کی طرف دیکھ نہ سکتے تھے ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ انھوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور گھر والوں نے مدد دے کر انھیں شیر بنا دیا۔

خروج نادری

ٹھیک اسی زمانہ میں جبکہ فرمانروایان مغلیہ ہند خانہ جنگیوں، عیش پرستیوں اور غفلتوں کا شکار ہو رہے تھے اور ان کے بخت خوابیدہ پر بدنصیبی و بداقبالی مستولی تھی۔ سرزمین ایران میں نادر قلی معروف بہ نادر شاہ درانی کا نصیب جاگا اور اس کے نجم اقبال نے دنیا میں چکاچوند ڈال دی۔

نوٹ نمبر 1 - نادر قلی۔ نادر قلی نام، امام قلی گڈریے کا بیٹا تھا۔ جو 1100ھ میں پیدا ہوا۔ انتہائی افلاس کے باعث ابتدائی حالات پردہ خفا میں ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ ازبکوں کی قید میں پڑا اور اسی وقت سے صفحات تاریخ میں نمایاں ہوا۔

نادر 4 برس کے بعد ازبکوں کی قید سے نکل کر بھاگا اور اپنے ملک کے ایک امیر بابل بیگ کا ملازم ہوا۔ چند سال بعد اس کو قتل کر کے اس کی بیٹی کو بھگا لے گیا اور مدتوں رہزنی کرتا رہا۔ یہی قزاقی اس کی شہرت کا باعث ہوئی۔ اور شاہ طہماسپ صفوی فرمانروائے ایران نے اس کو سپہ سالار افواج خراسان مقرر کر دیا۔ کچھ دنوں

بعد اس کے بڑھتے ہوئے زور سے خوفزدہ ہو کر بادشاہ نے اس کو تاج و تخت پیش کیا۔ مگر نادر نے مصلحتاً انکار کر دیا۔ آخر کار صفوی خاندان کے خاتمہ پر وہ بادشاہ بن بیٹھا اور نادر شاہ کے نام سے سکہ چلایا۔ اس کے سکہ پر یہ شعر مسکوک تھا۔

نادرم در ملک ایراں قادرم بر بحر و بار لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

بادشاہ بننے پر سب سے پہلے قوم افغان کو اپنا رفیق بنایا۔ جس کے اکثر جرگے اس کے مخالف رہے۔ اسی قوم کو بھگاتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان کو لوٹ کر اور محمد شاہ کو تاج و تخت بخش کر ایران کو مراجعت کی۔ آخر میں وہ بہت بدمغ، مغرور، جابر اور شکی مزاج ہو گیا تھا۔ اپنی ایرانی فوج سے مشتبہ ہو کر اس نے سب کے قتل کرا دینے کا منصوبہ باندھا۔ مگر قبل از وقت راز طشت از بام ہو گیا۔ اور وہ امرائے ایران کی سازش سے 1747 میں قتل کر دیا گیا۔ (ماخوذ از بڑی جنتری)

نہیب نادری

1739 میں اس مشہور و معروف فاتح نے سلاطین مغلیۂ ہند کی کمزوری و عیش پرستی اور نظام سلطنت کے اختلال و اضمحلال سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی۔ محمد شاہ رنگیلے کو ہزار بار چونکایا، بہت کچھ جھنجوڑا لیکن مست الست بادشاہ نے کروٹ تک نہ لی۔ چونکا بھی تو اس وقت جب کار از دست رفتہ و تیر از کمان جستہ کا مضمون صادق آ چکا تھا اور سرزمین ہند زبانِ حال سے نوحہ کناں تھی۔ ع

''یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد''

فتح نصیب نادر کی فوجیں دلّی تک دراتی چلی آئیں اور وہ گلزار دہلی جس نے نخل بندانِ بستان دولت تیموریہ ہند کے زیر سایہ سینکڑوں بہاریں دیکھی تھیں۔ خزاں نادری کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہ لا سکا، مادر ہند کے ہزاروں سپوت نادر شاہی قزلباشوں کی تیغ بے دریغ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لاکھوں بے خان و مان ہوئے اور بہتوں کو انقلابِ روزگار نے خاک میں ملا دیا۔ عروس الہند دلّی لٹ کھسٹ کر ایک اجڑا دیار بن گئی۔

''تخت طاؤس'' کا ''نادر'' کے قبضہ میں پہنچنا

فتح مند نادر نے قرۂ باصرۂ سلطنت یعنی ''بنت محمد شاہ'' کا عقد اپنے بیٹے مرزا نصر اللہ 1 سے کیا۔ اور ستاون (57)۔ اٹھاون 58 دن قیام کرنے کے بعد دہلی واودھ کے امراؤ شرفا کا تمام اندوختہ مال ومتاع اور وہ کل دولت جسے عہد بابری یا دوصد سالہ مدت سے سلاطین مغلیہ جمع کرتے چلے آئے تھے، شاہی تاج، سلطانی تخت، بیگمات کے مرصع زیورات، خزانہ ہندوستان کے چشم و چراغ کوہ نور و تخت طاؤس عمدہ سے عمدہ ہاتھی، نفیس ترین گھوڑے، بہترین توپیں اور بیش قیمت اطلس و کمخواب غرض ستر کروڑ (700000000) روپیہ کے قریب کا نقد وجنس لے کر ایران کو مراجعت کی 2۔

نوٹ نمبر 1۔ ''نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی'' از سید آغا حیدر (شائع شدہ رسالہ ''حسن'' دکن نمبر 11 جلد 3)=12

نوٹ نمبر 2۔ تاریخ ہند اسمتھ حصہ سوم اور ''نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی''

فہرست مال مغروبتہ نادر بقول منشی سعید احمد مارہروی مصنف ''امرائے ہنود''

(بحوالہ کاغذات دفتر انشا بھوپال)

نقد از خزانہ سلطنت 8 کروڑ 50 لاکھ۔ جواہرات از جواہر خانہ شاہی 15 کروڑ۔ آلات طلائی ایک کروڑ۔ 50 لاکھ۔ ''تخت طاؤس'' و اسباب متفرق واز خوشبو خانہ، باورچی خانہ، تورخانہ فراش خانہ، و آبدار خانہ 15 کروڑ۔ متفرق جواہر و نقد 40 لاکھ۔ از آصف جاہ نظام الملک 4 کروڑ۔ پیش کش نواب ابو المنصور خاں 2 کروڑ۔ از ضبطی خانہ خان دوران خاں ومظفر خاں میر آتش 2 کروڑ 70 لاکھ۔ از نواب محمد خاں بنگش 2 لاکھ 75 ہزار۔ از لطف اللہ خاں داروغہ جواہر خانہ 9 لاکھ۔ از وزیر الممالک نواب قمر الدین خاں ایک کروڑ۔ از شیخ سعد اللہ دیوان تن 3 لاکھ پچاس ہزار۔ از رائے خوشحال چند پیشکار بخشی گری 2 لاکھ پچاس ہزار۔ از نوندرائے 2 لاکھ 50 ہزار۔ از سبحان رائے 2 لاکھ 75 ہزار۔ از حصہ داراں دفتر عمائد شہر 2 کروڑ۔ معرفت راجہ مہا نرائن برائے خلعت صوبۂ اودھ 2 کروڑ۔ از راجہ ناگرمل دیوان خالصہ 3 لاکھ۔ از سیتا رام خزانچی 2 لاکھ 50 ہزار۔

میزان کل۔ 523860000

بقول مسٹر ولیم اروِن۔ظرف نقرئی وطلائی 30 کروڑ۔جواہرات 25 کروڑ''تخت طاؤس'' دوسرے
9 تخت اور ظروف مرصع 9 کروڑ۔بیش قیمت سامان 2 کروڑ۔توپیں اور سامان آرائش 4 کروڑ۔
ماخوذ از بینوے۔ہاتھی 300 زنجیر۔گھوڑے 10 ہزار۔اونٹ 10 ہزار مہار۔
(کل میزان ستر (70) کروڑ نقد وجنس 20300 جانور)

بحوالہ انند رام مصاحب دیوان اودھ۔جواہرات جن میں تخت طاؤس بھی شامل تھا پچاس کروڑ۔زر بفت وغیرہ ایک کروڑ۔اشرفیاں اور روپیہ نقد ایک لاکھ اور چند ہزار۔کل 60 کروڑ ایک لاکھ کچھ ہزار (یہ اقوال لیٹر مغل سے ماخوذ ہیں)

نمائش ہرات اور اس میں ''تخت طاؤس'' کا رکھا جانا

واعبرتاہ!! دنیا نام ہے نمونہ ہائے رنگا رنگی کا، آہ!! اس قیامت خیز منظر کو فلک کج مدار کی کس ادا سے تعبیر کیا جائے کہ بھیڑوں کا چرانے والا، جنگل جنگل گھومنے والا چھپ چھپ کر یا دن دہاڑے سینہ زوری کرنے اور ڈاکے ڈالنے والا نادر جس کی سو پشتوں نے بھی کبھی سلطنت کے خواب نہ دیکھے ہوں گے زمانہ کی گردشوں کی بدولت عروس البلاد دہلی کو لوٹ مار کر آتا ہے۔اور تمام مال ومتاع اور خزائن وجواہر منہوبہ کی نمائش ہرات میں کرتا ہے۔یعنی نادر کی واپسی ہندوستان کے بعد 11 رمئی 1740 کو ہرات میں تمام جواہرات اسباب، نادرات ونفائس ہند آراستہ پیراستہ ہوتے ہیں اور وہ تخت طاؤس بھی رکھا جاتا ہے۔جو ایک دنیا کے لیے اعجوبۂ روزگار صنعت ثابت ہوا۔اور جس پر جلوس کر کے شاہجہاں نے حضار پر اس قدر ہیبت بٹھائی کہ ان پر عالم عبودیت طاری ہو گیا اور جس نے عقلائے دہر کو محو حیرت کر دیا اور اب نادر کے ہاتھ پڑ کر نہیب وغارت کی فہرست میں شامل ہو چکا1۔ یہ نمائش کیا تھی؟ ہندوستان کی لوٹ مار کے خزانوں کی نمود تھی۔ورنہ حسن ترتیب کی آرائش وزیبائش معلوم۔

تخت مذکور کا اس نمائش میں رکھا جانا اس عہد کے مشہور مورخ ولیم اروِن کے اس قول کی تردید کرتا ہے کہ

چونکہ تخت طاؤس کے پرزے علاحدہ علاحدہ تھے۔ اس لیے نادری لوٹ مار کے موقع پر اس کے مختلف پرزے مختلف مقامات پر چلے گئے 2۔

اگر یہ صحیح ہوتا تو یہ تخت نمائش ہرات میں کیونکر رکھا جاتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایران میں نادر کے قتل کے بعد جو اس کے جانشینوں کے عہد میں شورشیں برپا ہوئیں ان میں (جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے) یہ تخت ضرور پاش پاش ہو گیا تھا۔ اسی واقعہ کو لائق مورخ نے اس انداز سے بیان کیا ہے۔ مورخ مذکور کے بیان کے موافق تو دنیا میں اس تخت کا وجود ہی نہیں۔ حالانکہ اگلے واقعات بتلائیں گے کہ لوجہ وہ موجود ہے اور لوجہ عدیم الوجود۔

نوٹ نمبر 1 - نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی۔ از سید آغا حیدر صاحب حسن دکن 11=12

نوٹ نمبر 2۔ لیٹر مغل=12

"نادر" کا جشن فتح و فیروزی ہند منانا

مسطورہ بالا نمائش کے دوران میں "جشن فتح و فیروزی ہند" بھی منایا گیا تھا۔ یہ جلسہ 4- جون 1740 سے شروع ہو کر کئی دن تک رہا۔ درباری عیش کرتے تھے۔ سپاہی ناچ رنگ میں مشغول تھے۔ ہر طرف سے صدائے رقص و سرود بلند تھی۔ ہر شخص نے اپنے مقدور بھر عیش و عشرت کے سامان مہیا کیے تھے۔ غرض اتنا بڑا جشن شاہی اور ایسے اعلیٰ پیمانہ پر شاندار نمائش ہوئی کہ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی 2۔

نوٹ نمبر 1 - ایرانی کیا عالم کیا جاہل سب کے سب عجیب الخلقت جانور "ہاتھی" کو دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ کیونکہ انھوں نے اب تک اس جانور کی صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔ اس نمائش میں پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اس کا برائے العین مشاہدہ کیا (رسالہ حسن)

نوٹ نمبر 2 - نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی=12

قتل نادری

نادر کے ظلم و ستم اور سخت گیری و لا مذہبی سے تنگ آ کر اس کے ارکان دولت نے مجلس

مشاورت منعقد کی۔ جس میں چند سرداروں نے اس کے قتل کا بیڑا اٹھایا اور 1160ھ (1747) کی ایک رات کو اپنی فوج محافظ تن (Body guard) کے سردار صالح بیگ کی ضرب کاری سے معمولی مقابلہ کے بعد اس گہری نیند کا شکار ہوا کہ جس سے ''بغیر حشر کے ممکن نہیں جگالینا'' کسی نے تاریخ وفات کہی ''فی النار والستقر مع الدوالید ر'' جو نادر کے متعلق خیالات کا آئینہ ہے۔

نوٹ نمبر1- قاموس المشاہیر اور ''نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی'' =12

نادر کے بعد ایرانی خانہ جنگی

نادر کے مرتے ہی فارس اور اس کے ممالک محروسہ میں خاصی بدنظمی پھیل گئی۔ چاروں طرف سے دعوے داران سلطنت اٹھ کھڑے ہوئے۔ افغانستان میں ابدالی، غلزئی، بلوچی، ہزارہ اور قزلباش جرگوں کے اتفاق سے احمد خاں نے جو ابدالی خاندان کا رکن رکین تھا احمد شاہ ابدالی کے لقب سے طرح حکومت ڈالی اور ایران میں نادر کے مخالف اعلیٰ کا بھتیجا عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ 1

نوٹ نمبر1- تاریخ اسلام مصنفہ مولوی احسان اللہ عباسی =12

تخت طاؤس کا پارہ پارہ ہونا

اس خانہ جنگی کے اثر سے سلطنت کی طرح اسباب وارکان سلطنت بھی خالی نہ رہے۔ چنانچہ ایشیائی صنعت و ہندستانی دستکاری کا بہترین نمونہ شاجہاں کی نفاست پسندی و جدت طرازی کا مجسمہ شاہان مغلیہ ہند کا سرمایۂ ناز اور اقوام عالم کو اپنا شائق دیدار بنا کر ہندوستان کی طرف کھینچ کر لانے اور اپنے جلوے سے مبہوت و متحیر بنا دینے والا تخت طاؤس بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ چنانچہ لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنی کتاب پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن میں اس تخت پر تبصرہ کرتے ہوئے خراسان نامی کتاب سے اس کے مصنف مسٹر فریزر کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے۔

1822 میں مجھ سے ایک معمر و سن رسیدہ کُرد نے بیان کیا تھا: ''جب نادر شاہ قتل ہوا اور اس کا کیمپ لوٹا گیا تو تخت طاؤس اور اس کا مرواریدی چھتر ہمارے ہاتھ آیا تھا۔ جس کو فوراً

ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا''

یہی واقعہ ہے جس کو ولیم اردن نے شورش دہلی (بزمان نادر) کے ضمن میں لکھا ہے۔

پارہ ہائے ''تخت طاؤس'' کا دولت قاچاریہ کے ہاتھ آنا
اور
اِن ٹکڑوں کا نئی شکل میں متشکل ہونا

1212ھ (1795) میں آقا محمد خان قاچار (بانی دولت قاچاریہ) نے لطف علی خاں، ژند کو جو نادر کا ایرانی جانشین تھا۔ شکست فاش دے کر اس تخت کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس سے جبراً چھین لیے اور بقول بعض ان ٹکڑوں کو موزونیت کے ساتھ باہم وصل کرا کے ایک نئے طرز کا تخت بنوایا تھا۔ لیکن شاہ موصوف کا ترتیب جدید دلانا محقق نہیں البتہ مرزا نصر اللہ خاں فدائی دولت یار جنگ بہادر کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ امر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دولت قاچاریہ کہ چوتھے تاجدار ناصر الدین شاہ، قاچار نے ضرور ان اجزا کو باہم دیگر پیوست کرا کے ایک نئی شکل میں متشکل کیا ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

از چیز ہائے تازہ کہ شاہجہاں ساخت تختے بود از کومید و دیگر گہر ہائے شاہوار کہ آن را ''تخت طاؤس'' گویند شش کرور نیم پول ہند (بست و شش کروڑ توماں ایران) در ساختن آں بکار رفتہ است آں تخت با چندیں پارچہ ہائے نامور دیگر بدست نادر شاہ افتاد و آنہا را بہ ایران برد و آں تخت در آں کشور از پرتو افسر شہنشاہ خورشید کلاہ ناصر الدین شاہ قاچار آرائش دیگر گرفتہ۔

(''داستان ترکتازان ہند''۔ حصہ دوم 586)

نوٹ نمبر 1۔ آقا محمد خان قاچار۔ فارس کا بادشاہ جو خاندان قاچار سے تھا یہ محمد حسین خان قاچار حاکم ماژندران کا بیٹا تھا۔ عادل شاہ جانشین نادر نے بزمانہ طفولیت اس کو اپنے خواجہ سراؤں میں داخل کر لیا تھا۔ اس کے مرنے پر یہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے باپ کو کریم خاں ژند بادشاہ وقت نے قتل کرا دیا اور آقا محمد خان نے خود کو اس کے حوالہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسے شیراز میں قید کر دیا۔ مدتوں شہر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی، پھر

صرف شکار کے لیے اجازت مل گئی۔ ایک دن کریم خان کی علالت کے زمانہ میں شکار کے حیلہ سے فرار ہو گیا۔ اور ماژندراں جا کر دم لیا۔ اور تخت فارس کے مدعی ہونے کا اعلان کر دیا۔ 1780 میں علی مردان خاں بادشاہ وقت کے فوت ہونے پر خاموشی کے ساتھ اصفہان پر قابض ہو گیا اور لطف علی خان آخری فرمانروائے خانداں ژند سے کئی برس تک معرکہ آرار ہے اور 1795 میں اس کو قتل کرنے کے بعد شاہ ایران بن گیا اور 20 سال تک فارس کے بڑے حصہ پر حکومت کر کے 63 سال کی عمر میں 1797 میں دو ملازموں کے ہاتھ سے جن کو پھانسی کا حکم دیا تھا قتل ہوا۔ گویا وہ خاندان قاچار یہ فرمانروائے ایران کا مورث اعلیٰ تھا۔ فتح علی شاہ جو اس کا بھتیجا تھا اس کا جانشین ہوا۔ اس نے 1824 میں وفات پائی۔ اس کے بعد محمد شاہ بن عباس مرزا تخت نشین ہوا۔ جو 1847 میں راہی ملک بقا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ کجکلاہ بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد مظفر الدین شاہ۔ اس نے 1907 میں اپنے بیٹے محمد علی شاہ کو حکومت اور رعایا کو پارلیمنٹ عطا کی۔ پارلیمنٹ نے محمد علی کو معزول کر کے اس کے نابالغ بیٹے احمد شاہ کو 1912 میں تخت نشین کیا۔ یہ 1925 میں سیاحت یورپ کے لیے گیا ہوا تھا۔ اور پیرس میں مقیم تھا کہ اس کے عیاشانہ رویہ سے ناراض ہو کر ایرانی پارلیمنٹ نے 31 اکتوبر 1925 کو اسے معزول کر دیا اور شہنشاہ رضا خان پہلوی (بانی حکومت پہلویہ) بادشاہ ایران تسلیم کر لیے گئے۔ گویا خاندان قاچار کے سات بادشاہوں نے 130 سال تک حکومت کی۔ (اور نٹیل بٹل)=12

نو مرتب تخت کی موجودہ حالت

بہر حال یہ نو مرتب تخت لارڈ کرزن آنجہانی کے بیان کے موافق ایرانی شاہی خاندان کے محلات کے نئے عجائب خانہ واقع طہران (پایہ تخت ایران) میں رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ مذکورہ بالا کتاب میں اس تخت کے حالات کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

آج کل اس تخت کے صرف کچھ حصے باقی رہ گئے ہیں۔ جو کہ ٹیورنیر کے تحریر کردہ مفصل حالات کا جزو ہیں۔ چھتری کا نام و نشان نہیں ہے۔ نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ تخت میں چھت کس طرح لگی ہوئی تھی مور بھی معدوم ہیں۔

چونکہ مذکورہ بالا نو مرتب تخت، قدیم تخت طاؤس کے اجزا اور اصلی صنعت و کاری گری کے بیشتر حصص پر مشتمل ہے اور مجازاً جزو کا استعمال کل پر روا ہے۔ اس لیے اس تخت کو بھی "تخت

طاؤس'' ہی کہنا چاہیے۔

چند اور ٹکڑوں کا انکشاف

منشی سعید احمد مار ہروی اور دیگر معتبرین سے معلوم ہوا کہ کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اس تخت کے کچھ ٹکڑے سلطنت عثمانیہ (ٹرکی) اور زاران روس کے قبضہ میں بھی تھے اور ٹرکی والے ٹکڑے انقلاب ٹرکی کے بعد فروخت کے لیے فرانس بھیجے گئے تھے۔

تخت طاؤس کے رقیب شہرت

دنیا میں کئی تخت ''تخت طاؤس'' کے نام سے موسوم ہوئے جن میں سے بعض نے تو اکثر اہل نظر کو دھوکا دے کر اس کی قدر ومنزلت بھی حاصل کر لی۔ تاہم نظر بازوں سے اصلیت پوشیدہ نہ رہی اور انھوں نے تاڑ لیا کہ فربہی چیزے دگر آماس چیزے دگر است۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''تخت طاؤس کے رقیبان شہرت کے مختصر حالات بھی قلمبند کر دیے جائیں۔

تخت طاؤس ساختہ بہادر شاہ اول یا اکبر شاہ ثانی

1 - تخت طاؤس ساختہ بہادر شاہ اول یا اکبر شاہ ثانی شہنشاہ ہند۔ اس تخت کو ان دونوں بادشاہوں میں سے کسی ایک نے بنوایا تھا۔ اور گو ایسا زیادہ بیش قیمت اور بے مثل صنعت ودستکاری کا نمونہ نہ تھا۔ تاہم بے حد نفیس اور بہت اچھا تخت تھا۔

ہم اس سے قبل عنوان ''تخت طاؤس کی تصویر'' کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ عرصہ ہوا جب اس کی ایک قلمی تصویر قلعہ معلیٰ دہلی میں موجود تھی۔ جس کو لوگ غلطی سے مدتوں شاہجہانی تخت طاؤس کی شبیہ سمجھا کیے۔ اب یہ تصویر بھی معدوم ہے۔ البتہ اس کی عکسی تصویر لون اگزیبیشن آف انٹی کویٹز کارونیشن دربار 1911 نامی کتاب کے صفحہ 152 پر موجود ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ تخت اصلی تخت سے بہت کچھ مشابہ ہوگا بھوپال کے کاغذات ''دفتر انشا'' کے حوالہ سے جو منشی سعید احمد صاحب مار ہروی صاحب'' امرائے ہنود'' نے نادر کے مال مغروتہ، ومنھوبہ ہند کی ایک فہرست ''امرائے ہنود'' میں دی 1 ہے۔ اس میں تخت طاؤس کے علاوہ نو (9) اور دوسرے تخت بھی

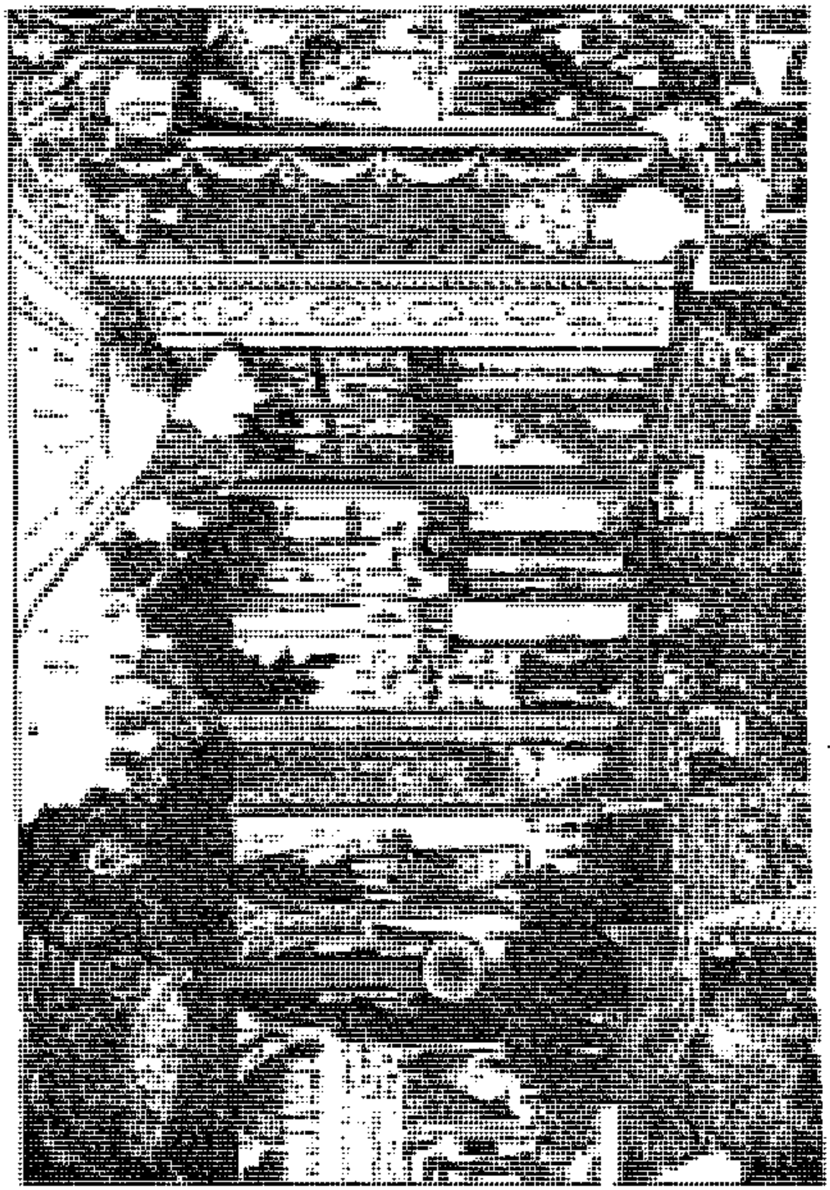

تخت طاؤس کا منظر (گلستان محل طہران میں)

لکھے ہیں جو نادر ایران لے گیا تھا۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ شاید ان میں یہ بھی شامل ہو۔ بہر حال اس کے حالات قطعی تاریکی میں ہیں۔ اور اس کو معرض بحث میں لانا بالکل فضول ہے۔

نوٹ نمبر 1 — دیکھو حواشی 2 صفحہ 205

تخت طاؤسی ساختہ فتح علی شاہ قاچار

2 — تخت طاؤسی ساختہ فتح علی شاہ قاچار فرمانروائے ایران: اس تخت کو شاہ موصوف نے اپنی نئی اور چہیتی حرم طاؤس خانم کے نام سے منسوب کر کے بنوایا تھا۔ یہ بہت معمولی اور کم قیمت تخت ہے۔ اس کی تصویر مشہور انگریزی اخبار السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی اشاعت 15 ستمبر 1929 میں شائع ہو چکی ہے 1۔ اور جیسا کہ ہم اس سے قبل ''تصویر تخت طاؤس'' کے تحت میں ذکر کر آئے ہیں بک آف نالج میں بھی موجود ہے۔

اس تخت کو بقول لارڈ کرزن آنجہانی اصلی تخت طاؤس سے بجز علاقۂ ہمنامی سے کوئی نسبت نہیں۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہی وہ تخت ہے جس کو تخت طاؤس کا حقیقی رقیب شہرت کہنا چاہیے اور اس تخت نے لوگوں کو بے حد مغالطہ میں ڈالا ہے۔ چنانچہ بمبئی کے چند اولوالعزم پارسی سیاح جنھوں نے بسواری سائیکل دنیا کے سفر پر کمر ہمت باندھی، اپنے سفر کے دلچسپ روزنامچہ کا ایک حصہ انڈین نیشنل ہیرلڈ نامی صحیفہ میں شائع کرتے ہوئے اسی تخت کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ہم نے بادشاہ کا محل دیکھا جو بالکل عجائب خانہ ہے 2۔ نادر کا لایا ہوا تخت طاؤس یہاں موجود ہے''

ایک اور انگریز سیاح، اخبار فیلڈ میں لکھتا ہے:

''آخر ہم خزانۂ شاہی تک پہنچ گئے۔ مقفل کمرہ پر مہر لگی ہوئی تھی مہر توڑ کر قفل کھولا گیا اور دروازہ کھلا تو سامنے دستکاری اور مینا کاری کا وہ عبرت انگیز نمونہ دھرا تھا۔ جسے ''تخت طاؤس'' کہتے ہیں۔ تخت طاؤس کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک تو کا ؤچ ہے زمین سے تین فٹ اونچا آٹھ فٹ

لمبا اور پانچ فٹ چوڑا جو چھ پایوں پر قائم ہے۔ اور مور کی چھاتی کی شکل کا بنا ہوا ہے۔ سیڑھیاں بھی لگی ہیں۔ ستارہ جو بڑے بڑے ہیروں سے مرصع کیا گیا ہے اِدھر اُدھر گھمایا جاسکتا ہے۔ کرسی کی پشت چھ فٹ اونچی ہے بازو میں پائدان لگا ہوا ہے۔ کرسی اور کاؤچ دونوں خالص سونے سے منڈھے ہوئے ہیں۔ جس پر نہایت اعلیٰ مینا کاری کا کام کیا گیا ہے۔ سونے میں ہیرے، لعل، یاقوت اور دیگر جواہر اس نفاست کے ساتھ جڑے گئے ہیں کہ مور کی دم کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ تخت ہندوستان میں شاہجہاں نے بنوایا تھا۔ 1735 میں نادرشاہ اسے اٹھا کر ایران لے آیا تھا'' حالانکہ ہر دو سیاحوں نے ایرانی تخت طاؤس کی سیر کی ہے 3۔

اس حقیقت کو مولوی عبداللہ صاحب قریشی بی۔ اے نے رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کے عید نمبر بابت سال 1927 میں ایک تاریخی مقالہ ''شاہنشاہ 4 رضا خان شاہ ایران'' کے عنوان سے شائع کرتے ہوئے بخوبی بے نقاب کیا ہے۔ آپ نے جہاں بانی دولت پہلویہ کی تاجپوشی کا تذکرہ کیا ہے وہاں تحریر فرمایا ہے:

''تخت طاؤس بھی بجائے خود ایک نفیس چیز ہے مگر وہ سیاحین کے بیان کے بموجب تخت نادری یا اصلی ''تخت طاؤس'' کا جس کی یہ نقل ہے اور جو عنقا صفت ہے کسی حالت میں بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ موجودہ ''تخت طاؤس'' میں صرف چند جواہرات اور دو چھوٹے چھوٹے مور ہیں۔ شامیانہ بالکل ہی نہیں۔ اس کی وضع قطع، تراش خراش اور نقش ونگار دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ دراصل اسی مشہور و معروف کنیز کے آرام کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ جس کا نام ''طاؤس'' تھا اور جس پر بادشاہ بے طرح شیدا تھا۔ یہ ''تخت طاؤس'' درباری کمرے کے آخر میں رکھا گیا اور اس کے بالمقابل ''تخت نادری'' آراستہ کیا گیا اور اسی پر ''رضا خاں'' کی تاجپوشی عمل میں آئی۔

دراصل بقول مسٹر میلکم اس زمانہ کی ایرانی بدامنی و جنگ و جدل کے باعث حالات ہی فراہم نہ ہوسکے۔ جن سے یہ پتہ چلتا کہ بعد کا بنا ہوا تخت اس ''تخت طاؤس'' کی نقل ہے جس کا ذکر ''ٹیورنیر'' نے کیا ہے 5۔

نوٹ نمبر 1۔ یہ تصویر، اتمام کتاب اور تکمیل مقدمہ کے کئی ماہ بعد جبکہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول

مین پوری کوتبدیل ہو چکا ہوں۔ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی اور مسٹر سری چند گولس بی اے ایل ٹی اور خواجہ حمید اللہ سی ٹی کی عنایتوں کی بدولت میری نظر سے گزری تھی۔ضروری سمجھ کر میں نے کتاب ہذا میں ذکر کر دیا۔یہ وجہ ہے کہ تاریخ مقدمہ نگاری و تاریخ اشاعت تصویر میں اختلاف ہو گیا ہے۔

نوٹ نمبر 2۔''ترجمان'' اخبار جھانسی۔مورخہ 23 اکتوبر 1927

نوٹ نمبر 3۔آگرہ اخبار مورخہ 7 نومبر 1928=12

نوٹ نمبر 4۔دیکھو حاشیہ 6 صفحہ 169 پر حالات رضا خان=12

نوٹ نمبر 5۔پرشیا اینڈ دی پرشین کوئچن=12

''تخت طاؤس'' ساختہ نادر

3۔تخت طاؤس ساختہ نادر شاہ: سر میلکم موصوف کے بیان کے موافق نادر شاہ تخت طاؤس کا اتنا شائق تھا کہ اس نے اس کی ایک اور ہو بہو نقل دوسرے جواہرات میں بنوائی۔مورخ موصوف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخت بھی نادر کی قتل والی شورش میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:

''اس طرح اس کی موت اور گزشتہ دو صدی کے عرصہ میں دو تخت خراب و خستہ ہوئے1''

مگر دراصل ایسا ہے نہیں۔کیونکہ مسٹر فریزر کے بیان سے اس تخت کا شکست و غارت ہونا مشکوک ہو جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''جیسا کہ اس کرو کے بیان سے ظاہر ہے۔اس نے (اصلی) تخت طاؤس یا کم از کم دونوں (ساختہ نادر و ساختہ شاہجہاں) میں سے کسی ایک تخت طاؤس کی بربادی کو بڑی خوشی سے دیکھا2''

اور مولانا عبداللہ صاحب قریشی کے بیان سے تو قطعی طور پر ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے اور اس تخت (ساختہ نادر) کی موجودگی کا ایقان ہو جاتا ہے۔

بہادر شاہ، اول یا اکبر شاہ ثانی کے بنوائے ہوئے تخت کا تو تذکرہ فضول ہی ہے۔کہ

معدوم ہو چکا اور اسم بغیر مسمیٰ محال اور نادر شاہ کے تخت کا ذکر بھی عبث کہ وہ بھی عام طور پر تخت طاؤس کے نام سے مشہور نہیں بلکہ تخت نادری کہلاتا ہے۔ہاں ہندستانی،شاہجہانی ''تخت طاؤس'' اور فتح علی شاہی ایرانی ''تخت طاؤس'' کے اسما میں بھی ان کی حقیقت کی طرح ایک خاص فرق و امتیاز کر دینا چاہیے تا کہ تاریخ بین اور محقق حضرات مغالطہ سے محفوظ رہیں۔

نوٹ نمبر 1-2- پرشیا اینڈ دی پرشین کوئیچن =12

امتیاز اسما

میں نے اکثر اہل قلم حضرات کے یہاں تخت طاؤسی لکھا ہوا دیکھا ہے اگر قدیم اور قلمی تاریخوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاہجہان نے تخت طاؤس نام رکھا تھا۔اس لیے اس تخت کو تخت طاؤس ہی کہنا اور لکھنا چاہیے کہ موافق وضعیت ہے اور ایرانی فتح علی شاہی تخت کو اس حیثیت سے کہ وہ طاؤس خانم کے نام سے منسوب ہے باضافۂ (ی) نسبت تخت طاؤسی تحریر کرنا چاہیے۔اس طرح لوگوں کو دھوکا بھی نہ ہوگا اور آسانی سے دونوں میں تمیز بھی کی جا سکے گی۔(اللہ بس باقی ہوس)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قدیم ہندوستان کی تاریخ

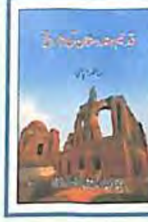

مصنف: رام شنکر ترپاٹھی
مترجم: سید یحییٰ حسن نقوی
صفحات: 581
قیمت: -/138 روپے

اکبر سے اورنگ زیب تک

مصنف: ڈبلو۔ایچ۔مورلینڈ
مترجم: جمال محمد صدیقی
صفحات: 436
قیمت: -/94 روپے

جامع تاریخ ہند

مصنف: محمد حبیب، خلیق احمد نظامی
صفحات: 1000
قیمت: -/222 روپے

مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال

مصنف: ایس۔این۔ترپاٹھی
صفحات: 584
قیمت: -/118 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

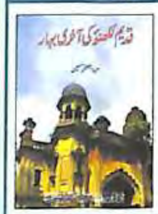

مصنف: مرزا جعفر حسین
صفحات: 560
قیمت: -/134 روپے

ہمایوں نامہ

مصنفہ: گلبدن بیگم
مترجم: عثمان حیدر مرزا
صفحات: 96
قیمت: -/20 روپے

₹ 86/-

ISBN: 978-93-5160-022-0

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025